کبیر

کبیر بانی

(گیت، ترجمہ اور حواشی)

مرتبہ: سردار جعفری

کبیر

کبیر بانی

(گیت، ترجمہ اور حواشی)

مرتب:

سردار جعفری

آج کی کتابیں

کبیر

کبیر بانی

مرتب: سردار جعفری

پہلا پاکستانی ایڈیشن: ۲۰۰۱ء

دوسرا پاکستانی ایڈیشن: ۲۰۰۵ء

ISBN 969-8379-33-9

طباعت: ذکی سنز پرنٹرز، کراچی

آج کی کتابیں

316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: (92-21) 5650623, 5213916

ای میل: ajmalkamal@gmail.com

ہوتھی بڑھ بڑھ جگ نوا، پنڈت بھیا نہ کوئے
ڈھائی اچھر پریم کے پڑھے سو پنڈت ہوئے

کبیر

پیدائش: بنارس، ۱۳۹۸ء یا ۱۴۴۰ء

وفات: مگہر، ۱۵۱۸ء

دیباچہ

بڑی شاعری کی یہ عجیب و غریب خصوصیت ہے کہ وہ اکثر و بیشتر اپنے خالق سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے وجود سے شاعر کا وجود پہچانا جاتا ہے کیوں کہ اس کی زندگی کے حالات گزرے ہوئے زمانے کے دھندلکے میں کھو جاتے ہیں اور واقعات افسانے کا لباس پہن لیتے ہیں۔

پرانی تاریخ نگاری چوں کہ بادشاہوں، پروہتوں اور سورماؤں کے گرد گھومتی تھی اور انھیں کی داستان کو اپنا سرمایہ سمجھتی تھی اس لیے اس نے ہمیشہ باغیوں، شاعروں اور فن کاروں کو نظر انداز کیا اور صرف سزا و جزا کے افسانے باقی رہ گئے (کسی کا منھ موتیوں سے بھر دیا گیا اور کسی کی گستاخ زبان گدی سے کھینچ لی گئی)۔ لیکن وقت کا انتقام بڑا سخت ہے۔ بادشاہوں کے کارنامے تاریخ کی کتابوں میں بند ہیں اور شاعروں کے کارنامے دلوں کے اندر درد اور مسرت کی لہریں بن کر اتر گئے ہیں۔ لکشمی اور سرسوتی کی باہمی رقابت میں جیت سرسوتی کی ہوئی اور گن لکشمی کے گائے گئے۔

یہ بات شاید پرانے تاریخ نگاروں کو نہیں معلوم تھی کہ تاریخ محض واقعہ نگاری نہیں بلکہ سماجی اور معاشی رشتوں کی تبدیلی کی داستان بھی ہے اور فکر و شعور کا سفر بھی۔ اس فضا میں آتے جاتے کردار پرچھائیوں کی طرح گھومتے رہتے ہیں اور اگر پرچھائیوں کا نام فراموش ہو جائے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا — فکر و شعور کا سفر جاری رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالات و واقعات کا کبیر، من اور تاریخ کا کبیر زندہ نہیں ہے

لیکن فکر اور شعور کا کبیر، جذبے اور احساس کا کبیر، شعر اور نغمے کا کبیر زندہ ہے۔ ہر دوہا اس کی ہستی ہے، ہر پد (نظم) اس کی ذات، ہر خیال اس کی زبان۔ اور جب ہم اس کے بولے ہوئے لفظوں کو دہراتے ہیں تو کبیر کا ساز بجنے لگتا ہے، شاہی فرمان اور ڈنکوں کی آوازیں گونگی ہو جاتی ہیں اور کبیر کے دل سے نکلنے والی صوت سرمدی سے روح سرشار ہو جاتی ہے۔ پنڈت کا منتر اور ملا کی اذان آسمانوں کے سناٹے میں گم ہو جاتی ہے اور کبیر کا حرف محبت دھرتی کے سینے میں دھڑکتا رہتا ہے۔

یہ بات اہم نہیں ہے کہ کبیر داس جلاہے کے بیٹے تھے یا کسی برہمنی کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے اور جلاہے کے گھر میں پرورش پائی تھی[1]۔ اہم یہ ہے کہ رامانج (بارھویں صدی) اور اُن کے سلسلۂ فکر کی ایک معنوی اولاد رامانند (چودھویں اور پندرھویں صدی) کے خیال سے کبیر کے خیال کا کیا رشتہ ہے، بھگتی کے انتر گیان کا تصوف کے وجدان سے کیا تعلق ہے، ایران کے صوفی شعرا عطار، رومی اور حافظ کی فکر نے ہندوستان کی فکر کو کس حد تک متاثر کیا ہے، اُن کے درمیان کتنی مشترک قدریں ہیں اور اثرات کی یہ بہتی ہوئی گنگا جمنا کبیر کی شاعری میں کتنا حسین سنگم حاصل کرتی ہے۔ صرف اس طرح تفریق اور نفرت کی وہ دیواریں گرائی جاسکتی ہیں جنھیں کبیر نے ڈھا دیا تھا لیکن ان کے بعد کی نسلوں نے پھر اونچا اٹھا دیا۔ اس پر لڑنے مرنے والے کہ کبیر لنگی پہنتے تھے یا دھوتی باندھتے تھے، یہ بھول جاتے ہیں کہ اصلیت لباس میں نہیں برہنگی میں ہے۔ جس نے معنی کے جسم سے لفظوں کے پردے اٹھا دیے ہوں اور رام اور رحیم کو ایک کر دکھایا ہو، اس کو سوت اور کپاس کا لباس پہنانے کی کوشش اور اس لباس کی تفریق پر منافقت اور نفرت انگیزی کتنی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔

کبیر داس کی پیدائش اور موت کی تاریخوں کے بارے میں کچھ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا؛ بس اتنی بات یقینی ہے کہ پندرھویں صدی کبیر کی صدی ہے۔ ان کی عمر کا اندازہ ایک سو بیس سال کیا جاتا ہے۔ ان کے ایک چیلے دھرم داس سے ایک دوہا

منسوب ہے جس کے اعتبار سے برہم وت ۱۴۵۵ کے اختتام پر کبیر کی پیدائش کی تاریخ جیٹھ کی پورنیما کو سوموار کے دن نکلتی ہے۔ اس بنیاد پر ۱۳۹۸ء سال پیدائش قرار پاتا ہے۔ (بعض لوگوں کے نزدیک سال پیدائش ۱۴۴۰ء ہے۔ دیکھیے ایلون انڈربل کا دیباچہ، کبیر کی نظموں کا انگریزی ترجمہ از ٹیگور۔) انتقال کا سال ۱۵۱۸ء بھی کبیر پنتھیوں کے ایک مشہور دوہے کی بنیاد پر تسلیم کیا گیا ہے۔

کبیر داس کا اپنا بیان ہے کہ وہ بنارس میں پیدا ہوئے اور مگہر (ضلع گورکھپور) میں وفات پائی — "سکل جنم شیو پوری گنوایا، مرتی بیر مگہر اٹھ دھایا"، یعنی سارا جنم بنارس میں بیتا اور مرتے وقت مگہر چلا گیا۔ اس میں اہم نکتہ یہ ہے کہ مرتے وقت بھی کبیر نے اپنی انقلابی ادا نہیں چھوڑی۔ جس طرح وہ انسانوں کی اونچ نیچ کے قائل نہیں تھے، اسی طرح وہ شہروں کی اونچ نیچ کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ عام ہندو عقیدہ یہ ہے کہ کاشی (بنارس) میں مرنے والے کی مکتی ہو جاتی ہے اور اس کے برعکس مگہر میں مرنے والا دوبارہ گدھے کا جنم لیتا ہے۔ لیکن کبیر، جن کو اپنی بھگتی پر پورا اعتماد تھا، اس بات کو کب مان سکتے تھے۔ اس لیے جب عمر کی اس منزل میں پہنچے جہاں موت قریب معلوم ہوئی تو وہ بنارس سے ترک وطن کر کے مگہر چلے گئے۔ ملک کے کونے کونے سے لوگ موت کی تلاش میں بنارس آتے ہیں اور کبیر مرنے کے لیے بنارس سے یہ کہتے ہوئے چل دیے:

کیا کاشی، کیا اُوسر مگہر، رام ہردے بس مورا
جو کاسی تن تجے کبیرا، رامے کون نہورا

(ترجمہ: کاشی ہو یا اُجاڑ مگہر، میرے لیے دونوں برابر ہیں کیوں کہ میرے دل میں بھگوان بسا ہوا ہے۔ اگر کبیر کی روح کاشی میں اس تن کو تج کر نجات حاصل کرلے تو اس میں رام کا کون سا احسان ہے۔) اس لیے کبیر، جو زندگی بھر کاشی کے باشندے تھے اور بادشاہوں کی طاقت اور تنگ نظر لوگوں کی نفرت بھی ان کو وہاں سے باہر نہ نکال

تھی، مرنے کے بعد اپنی مرضی سے مگہر کے باسی ہو گئے۔

اُن کی موت کے گرد اُن کے چاہنے والوں نے جس افسانے کی تخلیق کی ہے وہ کبیر کے لیے عوام کا سب سے بڑا خراج عقیدت ہے۔ ان کی تعلیم کا نچوڑ وہ خالص انسانی محبت ہے جو مذہب کی تفریق اور ذات پات کے جھگڑوں سے پاک ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی لاش پر ہندوؤں اور مسلمانوں نے تلواریں کھینچ لیں۔ ہندو ان کی لاش کو جلانا چاہتے تھے اور مسلمان دفن کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس جھگڑے کا فیصلہ اس طرح ہوا کہ کبیر کی لاش پھولوں کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہوگئی جسے دونوں فریقین نے برابر برابر بانٹ لیا۔ اس طرح ہندو رسم بھی ادا ہوگئی اور مسلمان رسم بھی، اور باہمی اختلاف ختم ہوگیا۔ اب مگہر میں املی کے ایک درخت کے نیچے کبیر کا مزار ہے اور بنارس میں ایک مٹھ ہے جو کبیر چورے کے نام سے مشہور ہے۔ اپنی ذات کے لیے کبیر نے زیادہ تر ''جُلاہے'' کا لفظ استعمال کیا ہے اور کبھی کبھی ''کوری'' اور ''کمینہ'' بھی کہا ہے۔ شمالی ہندوستان میں اب بھی ہندو بنکر کوری کہلاتے ہیں اور نیچ سمجھے جانے کی وجہ سے انھیں کمین یا کمینہ کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ (مسلم جلاہوں نے اپنے لیے ''مومن'' کے لفظ کا انتخاب کرلیا ہے جس کا کبیر کے عہد میں پتا نہیں چلتا۔) اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ کبیر کے عہد کے آس پاس ہی کوریوں کی ذات کے ایک بہت بڑے حصے نے اسلام قبول کیا تھا۔

کوریوں اور جُلاہوں کی بستیاں پنجاب سے بنگال تک کے علاقے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ پورے پورے قصبے ان سے آباد ہیں۔ شمالی ہندوستان میں بہار اور بنگال تک ترکوں کی حکمرانی بارھویں صدی کے آخر میں پرتھوی راج کی شکست (۱۱۹۳ء) کے ساتھ پہنچی۔ ۱۱۹۹ء میں قطب الدین ایبک نے بنارس فتح کیا اور اس کے فوراً ہی بعد محمد بختیار نے بہار کو تہہ تیغ کیا اور نالندہ کی مشہور عالم یونی ورسٹی کو خاک میں ملا دیا، بودھ بھکشوؤں کو قتل کر دیا اور کتابوں کو آگ لگا دی۔ اس طرح بودھ دھرم، جس کا زوال

بہت پہلے سے شروع ہو گیا تھا اور آٹھویں صدی تک مکمل ہو چکا تھا، بارھویں صدی کے خاتمے پر تقریباً نیست و نابود ہو گیا[2] اور نالندہ کے بچے کھچے بھکشو نیپال اور تبت کی طرف بھاگ گئے۔ (بودھ مذہب وہاں پہلے پہنچ چکا تھا۔) بودھ دھرم کے افسوسناک زوال کے بعد ہندوستان کے نیچ ذات کے اچھوتوں کے لیے اسلام ہی ایک پناہ گاہ رہ گیا تھا (چنانچہ اس عہد میں مشرقی بنگال کے گاؤں کے گاؤں اپنا بودھ دھرم چھوڑ کر مسلمان ہو گئے)۔ ترک حکمرانوں نے، جو مسلمانوں سے بڑھ کر فاتح اور حکمران تھے اور اپنے طبقاتی مفاد کو مذہب پر ترجیح دیتے تھے، اسلام پر ایمان لے آنے والے محکوموں کو برابری کا درجہ نہیں دیا[3]۔ وہ اب بھی کوری سے جلاہے ہو جانے کے بعد کمینے ہی سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے ان کی آخری پناہ گاہیں بھگتی اور تصوف کی پریم نگریاں بن گئیں اور ان دونوں خدا پرست اور انسان دوست تحریکوں کا حسین امتزاج کبیر داس اور ان کی شاعری کی شکل میں ظاہر ہوا۔

مفلسی تو ان کا پیدائشی حق اور باپ دادا کی میراث تھی مگر بھگتوں اور صوفیوں نے اسے ترک دنیا کے فلسفے کی شکل دے کر انقلابی بنا دیا۔ ظاہری مذہب حکمرانوں کے ساتھ تھا جو مال و دولت کے مالک تھے (وہ کبھی شمال مشرقی سرحد کے پہاڑوں کو عبور کر کے آتے تھے اور کبھی مقامی قلعوں سے اپنی فوجیں لے کر نکلتے تھے) اور باطنی مذہب یعنی تصوف اور بھگتی نے عوام کا ساتھ دیا جو مفلس اور محنت کش تھے۔ (یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ زیادہ تر صوفی اور بھگت دستکاروں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔) ظاہری مذہب کے مُلّا، قاضی، محتسب، پنڈت، پروہت وغیرہ بہت مہنگے تھے جو مذہبی رسوم کے جاننے والے تھے اور حکمرانوں کے اقتدار پر خدا اور بھگوان کی مرضی کی مہر لگاتے رہتے تھے۔ (اونچ نیچ خدا کی دین ہے۔ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے۔) لیکن باطنی مذہب کے رہنما یا گرو فقیر اور بھکشو تھے۔ ان کے جسم پر گیروا لباس ہوتا تھا، یا شاید وہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ ہاتھ میں بھیک کے پیالے، دل میں غم کی قندیل اور ہونٹوں

پر حرف محبت۔ وہ صاحب علم نہیں تھے، صاحب اسرار تھے۔ عقل والے نہیں تھے، عشق والے تھے۔ ان کے پاس نہ مندر تھے نہ مسجدیں، نہ اوقاف نہ جائیدادیں۔ ان کے پاس کتاب بھی نہیں تھی، صرف دل تھا۔ وہ ہر انسان کو یہی بشارت دیتے تھے کہ خدا محبت ہے اور محبت خدا ہے۔ انسان کا عشق خدا کا عشق ہے، اور یہ تبلیغ و تلقین مفت تھی۔

طبقاتی نفرت کے بغیر حکمراں حکومت نہیں کر سکتے تھے لیکن بھگتوں اور صوفیوں نے اس طبقاتی نفرت کے مقابلے پر انسانی برادری اور محبت کا نصب العین رکھا۔ حکمرانوں کے لیے سماجی حیثیت کا معیار دنیاوی دولت تھی۔ بھگتوں اور صوفیوں کے لیے انسان کے اعلیٰ درجے کا معیار بھگت پریم اور عشق حقیقی اور عشق مجازی تھا۔ مال اور دولت کی محبت اور جائیدادوں کی بندشیں اس عشق میں کمی کر سکتی تھیں، اس لیے ان بزرگوں نے ترک دنیا کو اپنی تعلیمات کا بنیادی جز بنایا۔ چنانچہ مولانا جلال الدین رومی نے دولت کو اس کلاہ سے تشبیہ دی ہے جو گنجے کے سر کو چھپاتی ہے، خوبصورت زلفوں والے ننگے سر ہی اچھے لگتے ہیں۔ بازار میں بکنے والے غلاموں کے جسمانی حسن کو ظاہر کرنے کے لیے انھیں ننگا کر دیا جاتا ہے۔ ان کی خرید و فروخت کرنے والے امیر اپنے بدصورت جسموں کو اطلس اور ریشم کی قباؤں میں چھپائے رکھتے ہیں۔

کبیر نے اپنی اس طبقاتی حیثیت کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ چنانچہ ایک نظم (۱۰۹) میں جب مایا سولہ سنگار کر کے اور اپنی مست آنکھوں کی لال تکور لے کر شاعر کے سامنے آتی ہے اور اسے اپنا بھرتار (دولھا یا شوہر) کہہ کر مخاطب کرتی ہے تو شاعر بڑے طنز سے کہتا ہے کہ "ہماری ذات جلاہے کی ہے اور نام کبیر ہے۔ ہمیں تو کبھی کسی نے پوچھا نہیں۔ تم وہاں جاؤ جہاں تخت بچھے ہوئے ہیں، باغ آراستہ ہیں، اناج کے بورے بھرے ہوئے ہیں، ریشم کی بھرمار ہے، اگر اور صندل گھسا جا رہا ہے۔ ہمارے پاس آ کر کیا کرو گی۔ ہم تو کمینوں کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔" ایک اور نظم (۱۱۰) میں انھوں نے مایا کو، جو صاحب اقتدار طبقوں کے لالچ کی علامت ہے، مہا ٹھگنی

کہا ہے، جس کے ہونٹوں پر میٹھے بول ہیں اور ہاتھ میں پھانسی کا پھندا ہے۔ ایک اور نظم میں مایا شکاری کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے جو نہایت بے دردی کے ساتھ انسانوں کا شکار کھیل رہی ہے۔ اس کے وار سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ ''اودھو مایا تجی نہ جائے''[۵] کے ساتھ مل کر اس نظم کو پڑھنے سے کبیر کا اصل مفہوم واضح ہوتا ہے۔

کبیر کے یہاں مایا کے تصور کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ شنکراچاریہ (آٹھویں صدی) کے اُدویت واد اور ان کے مخالف رامانج (۱۱۷۵ء، نہایت ۱۲۵۰ء) کے وششٹ اُدویت واد کے ایک نکتے کے باریک فرق کو ذہن نشین کرلیا جائے۔

دونوں اُپنشد کی اس تعلیم کو مانتے ہیں کہ سب کچھ برہمن ہے، (سرودم کھلو دم برہم) اور وہی سب سے بڑی سچائی ہے۔ اور آتمن (روح = خودی) اور برہمن (ذاتِ مطلق) ایک ہیں (آیم آتما برہم)۔ لیکن اس تعلیم کی تفسیر کے وقت دونوں الگ الگ راہیں اختیار کرتے ہیں، ایک کے یہاں خشک فلسفے کی چمک دار تلوار ایک عظیم عالمگیر ذہن کی تیزی کا پتا دیتی ہے اور دوسرے کے یہاں دل کی دھڑکن ازلی اور ابدی حقیقت میں انسانی روح کی حرارت پیدا کر دیتی ہے۔

شنکراچاریہ کا کہنا یہ ہے کہ چوں کہ برہمن (ذاتِ مطلق) ہی حقیقت ہے اس لیے مادی دنیا (مایا = سنسار) کی اپنی کوئی حقیقت نہیں، وہ صرف وہم و خیال (متھیا) ہے۔ اس کو انھوں نے اُدویت کہا ہے (یعنی وہ وحدت جس میں دوئی کی سمائی نہیں ہے)۔ لیکن رامانج کا کہنا یہ ہے کہ برہمن (ذاتِ مطلق) آتمن (روح = خودی) اور مایا (سنسار) الگ الگ پہچانے جاتے ہیں لیکن حقیقت میں الگ الگ نہیں ہیں، کیوں کہ آتمن اور مایا دونوں برہمن کے وشیشن (صفات) ہیں۔ گویا شنکراچاریہ صفات سے انکار کرتے ہیں اور رامانج صفات کو عین ذات مانتے ہیں۔ اس صورت میں برہمن (ذاتِ مطلق) کی وحدت باقی رہتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ آتمن (روح = خودی ۔ فرد = جیو) کی حقیقت اور اصلیت بھی باقی رہتی ہے۔ اس کو وششٹ

اُدویت کہا گیا ہے۔

شنکر اچاریہ کے یہاں وحدت میں کثرت کا سوال فلسفیانہ تاویلوں کا محتاج رہتا ہے اور رامانج کے یہاں شاعری اور نغمے کے دروازے کھول دیتا ہے اور نرگن کے آگے سرگن ناچنے لگتا ہے، صفات ذات کا اشارہ بن جاتی ہیں اور انا الحق کا ساز بجنے لگتا ہے۔ شنکر اچاریہ کے یہاں خدا غیر ذاتی ہے اور رامانج کے یہاں ذاتی۔ اس لیے ایک کی بھگتی سرد اور خشک ہے اور دوسرے کی بھگتی گرم اور رنگین۔ وہاں شونیہ کا سکون ہے اور یہاں مایا کا ہنگامہ، جو سنت اور بھگت شاعروں کے یہاں بے تابی، بے قراری اور سرشاری کا مشکیت بن جاتا ہے اور انھیں جلال الدین رومی اور حافظ شیرازی کے قریب لے آتا ہے۔ شنکر اچاریہ کے یہاں غیر ہندو افکار کی آمیزش ذرا مشکل ہے، اور رامانج کی دھارا میں بہت سے چشمے مل سکتے ہیں۔ چنانچہ کبیر کے یہاں یہ آمیزش صاف نظر آتی ہے۔ (لیکن کبیر کو سو فیصدی رامانج کا چیلا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔)

جیو اور مایا کو برہمن سے الگ پہچاننے کے بعد جیو کو حقیر اور مایا کو بے کار اور مکار نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس طرح جیو کی اہمیت کا اعتراف فرد کی عظمت کا اعتراف ہے اور وہ فرد شودر بھی ہو سکتا ہے اور براہمن بھی اور مسلمان بھی۔ فرد کی یہ اہمیت جاگیردارانہ سماجی رشتوں پر اثر انداز ہوتی ہے (جس میں عظمت کی بنیاد دولت اور طاقت تھی) اور ایک نئی انسان دوستی کے رشتے قائم کرتی ہے۔ اب مایا کو تج دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ اسے تج کیا جاتا ہے، برتا جاتا ہے اور کبیر کے الفاظ میں وہ "ہری بھگتوں کی چیری" (کنیز) بن جاتا ہے۔ (نظم نمبر ۱۰۵)

کبیر کے یہاں ترک دنیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی صرف اپنی ذات میں گم ہو جائے اور اپنی نجات کے لیے مراقبے میں کھو جائے۔ وہ خود شادی شدہ آدمی تھے اور صاحب اولاد تھے، کرگھے پر خود کپڑا بنتے تھے اور پھیری لگا کر اسے بیچتے تھے اور اس کی آمدنی سے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ ان کی مادی اور

جسمانی محنت ان کے روحانی نغموں کی تخلیق میں حائل نہیں ہوتی تھی بلکہ شاید اس میں مدد دیتی تھی۔ ان کو اس پر اصرار تھا کہ بھگوان اس دنیا میں ملتا ہے۔ نجات کا راستہ یہیں سے ہو کر گزرتا ہے (نظم نمبر ۴۰) اور مایا، جو مہا ٹھگنی ہے اور بے درد شکاری ہے، بھگتوں کی کنیز بن سکتی ہے (نظم نمبر ۱۰۵)۔ مایا تجی نہیں جاتی، تجی جا نہیں سکتی (نظم نمبر ۵) کیوں کہ وہ کسی نہ کسی شکل میں باقی رہتی ہے۔ دراصل مایا پر فتح حاصل کی جاتی ہے۔ جس طرح پوجا پاٹ، نماز روزہ، ظاہری عبادت سے صرف غرور (اہنکار) بڑھتا ہے لیکن بھگوان نہیں ملتا، ویسے ہی کپڑے اتار دینے سے یا اپنے پانچوں حواس کو قتل کر دینے سے بھگوان نہیں ملتا اور نہ وہ پہاڑوں پر جا بیٹھنے اور جنگلوں میں کھو جانے سے ملتا ہے (مایا وہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی)۔ ہری (بھگوان) اس پر ریجھتے ہیں جس کے دل میں رحم ہے، جو متقی اور پرہیزگار ہے، جو دنیا میں رہ کر دنیا سے اداس (بے نیاز) رہتا ہے اور ہر دی حیات کو اپنی طرح جانتا ہے اسی کو وہ تی وقیوم ملتا ہے (نظم نمبر ۶۵)۔ سائیں سے اس قسم کی لگن لگانا بہت مشکل ہے، اس کے لیے طبیعت کا انکسار اور صبر و قناعت ضروری ہے اور رہن سہن میں پورا اترنا چاہیے (نظم نمبر ۷۰)۔ اور ساری بات کو کبیر نے آخر میں یہ کہہ کر ختم کر دیا ہے کہ دیکھو پانڈے جی، فضول بحث مباحثے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ اس جسم کے بغیر شبد، کلمہ، نام، اناہت ناد، کچھ ممکن نہیں ہے، انسان اور کائنات سب مٹی ہے اور گووند کی شکتی (مایا) اس کو بناتی بگاڑتی رہتی ہے۔ ہمارا جسم ایک مٹی کا مندر ہے جس میں ہم نے گیان دھیان کا دیپک جلا رکھا ہے اور سانس کا اجالا ہے جس سے سارا جگ دکھائی دیتا ہے (نظم نمبر ۱۳)۔

اس مٹی کی دنیا کا، جس کی ذمے داریوں اور فرائض سے سبک دوش ہونا نجات کے لیے ضروری ہے، کبیر کے یہاں پورا احساس ہے اور غالباً بھگتی کا کوئی دوسرا شاعر اس شعور اور احساس میں کبیر کے قریب نہیں پہنچتا۔ اسلام میں انسان کی ذمے داریاں دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہیں، ایک حق اللہ ہے اور دوسرا حق العباد، یعنی ایک خدا کا حق

اور دوسرا بندوں کا حق۔ عبادت خدا کا حق ہے اور سماجی ذمے داریاں بندوں کا حق۔ خدا کے گنہگار کو، جس نے حق عبادت ادا نہیں کیا، خدا معاف کر سکتا ہے، لیکن بندوں کے گنہگار کو، جس نے اپنے عزیز و اقارب، پڑوسی، ہم وطن اور اہل دنیا کا حق ادا نہیں کیا، اس کو خدا معاف نہیں کرتا، صرف بندے ہی معاف کر سکتے ہیں، اس کے بعد ہی رحمت کے دروازے کھلیں گے۔ اس لیے کبیر نے دونوں حقوق کا ذکر کیا ہے

سرگن کی سیوا کرو، نرگن کا کرو گیان
نرگن سرگن کے پرے، تہیں ہمارا دھیان

کبیر پنتھیوں نے کبیر کی پیدائش کو ان حسین و جمیل لفظوں میں بیان کیا ہے

گھن گرجے، دامنی دمکے، بوندیں برسیں، جھرلاگ گئے
ہر تالاب میں کمل کھلے، تہاں بھانو پرگٹ بھئے

(ترجمہ: بادل گرج رہے تھے، بجلی چمک رہی تھی، بوندیں پڑ رہی تھیں اور مینھ کی جھڑی لگی ہوئی تھی، اس طوفان میں جب کبیر سورج کی طرح ظاہر ہوئے تو ہر تالاب میں کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے۔) اس دوہے کے الفاظ ممکن ہے کہ حقیقت ہی کی ترجمانی کرتے ہوں، لیکن اگر انھیں استعارے کی زبان سمجھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جنگوں کی گھن گرج میں، قتل و غارت کی بجلیوں میں، جہاں خون کی بارش ہو رہی تھی، کبیر کی پیدائش (ظہور) سے یکایک منظر پرسکون ہو گیا اور آسمان پر سورج نکل آیا اور تالابوں میں کنول کے پھول کھل گئے۔ قرون وسطی کے جنگ آلود ہندوستان کے پس منظر میں کبیر کی یہ شخصیت مبالغہ آمیز نہیں معلوم ہوتی۔

کبیر داس ایک مسلمان صوفی تھے جو ہندو بھگتی کی زبان میں بات کر رہے تھے۔ چوں کہ انھوں نے اپنے آپ کو بار بار "جلاہا" کہا ہے اس لیے یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اسلام کو ترک نہیں کیا تھا لیکن ان کی وضع ہندوؤں کی سی تھی۔ ماتھے پر تلک لگاتے تھے اور جسم پر جنیو پہنتے تھے۔ اور پھر جرأت اتنی تھی کہ

برہمنوں پر طنز کرتے تھے "تو بھاسن میں کاسی کا جولہا، بوجھو مور گیانا"۔ ہندوستان کی پوری تاریخ میں اتحاد کے اتنے خوبصورت اور جذباتی مظہر کی مثال نہیں ہے۔ اس عہد میں جب ترک حکمرانوں کی تلوار ہندوستان کے سر پر چمک رہی تھی، اس مسلمان جلاہے کے حرفِ محبت میں کتنی کشش ہوگی جس نے اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک ہندوؤں کے رنگ میں رنگ لیا تھا، اور یہ بھی یقین کیا جا سکتا ہے کہ کبیر سے آشنا ہونے کے بعد عام ہندو عام مسلمان سے نفرت نہیں کر سکتا تھا۔

کبیر نے منصور کی طرح انا الحق نہیں کہا لیکن انا الحق کا سارا جذبہ ان مصرعوں میں موجود ہے "نرگن آگے سرگن ناچے باجے سوہنگ تورا" (نظم نمبر ۲۸) یعنی ذات کے سامنے صفات ناچ رہی ہیں اور انا الحق کا سارنگ رہا ہے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ "اس کے وجود میں ایک دنیا کے بعد دوسری دنیا تسبیح کے دانوں کی طرح چل رہی ہے" (نظم نمبر ۱۴) تو پھر یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ ساری کائنات اس کی تسبیح میں مشغول ہے۔ اس طرح جب وہ عوام کی زبان میں یہ کہتے ہیں کہ "نرنکار، نرگن، اباسی، کرواسی کو سنگ" (نظم نمبر ۲۹) تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہندو پری بھاشا میں قل ہو اللہ احد کی تفسیر اسی طرح بیان کی جا سکتی ہے۔ کبھی کبھی اس درشن کے دیوانے "الست فقیر" کا نغمہ اسلامی فکر کی موجوں میں تبدیل ہو جاتا ہے "یا کریم، بل حکمت تیری، کھاک ایک صورت بہتیری" یعنی "اے کریم، میں تیری حکمت پر قربان جاؤں، ایک خاک سے اتنی ساری صورتیں بنا ڈالیں۔" اور کبھی وہ اسلامی عقائد کی زمین سے اٹھ کر ویدانت کے شونیہ آکاش میں چلے جاتے ہیں جہاں ذات و صفات سے بھی شعور بلند ہو جاتا ہے۔ پھر وہ کبھی کبھی اسلامی الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ہندو انداز فکر اختیار کر لیتے ہیں مثلاً "نبی آنکھوں میں موجود ہے، سیاہ اور سفید تلوں کے بیچ میں ایک تار ہے جس میں لاکھوں سورج طلوع ہوتے ہیں"۔ مگر اس ہزار رنگ انداز کے اندر شیوہ ایک ہی ہے جو یک نقطہ عشق میں سما جاتا ہے۔ باقی باتیں اس کی تفصیل اور تفسیر ہیں۔

یہ بات متفقہ طور سے مانی جاتی ہے، اور خود کبیر نے اس کا اعتراف کیا ہے، کہ وہ ان پڑھ تھے۔ لیکن ان کی پیدائش اور موت کی طرح ان کی شاگردی کے متعلق بھی اختلاف رائے ہے۔ مسلم روایت انھیں ایک صوفی پیر تقی کا شاگرد قرار دیتی ہے لیکن اپنی نظموں میں کبیر نے رامانند کو گرو مان کر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

پندرھویں صدی کے بنارس میں رامانند کی بڑی شہرت تھی۔ ویسے تو وہ ہندو سنت تھے لیکن ان کی مجلس (گوشٹی) میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے۔ کبیر کا لڑکپن تھا لیکن ان کی نگاہ انتخاب بھی رامانند ہی پر پڑی۔ اب مشکل یہ تھی کہ ایک مسلمان جولاہے کو وہ اپنی شاگردی میں قبول کریں گے یا نہیں، کبیر نے اس کا حل جس طرح تلاش کیا وہ بہت دلچسپ ہے۔ رامانند روز صبح سویرے گنگا میں اشنان کرنے جاتے تھے۔ ایک روز صبح کے وقت، جب ابھی اندھیرا تھا، کبیر گنگا کے کنارے سیڑھیوں پر لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر میں جب سوامی رامانند آئے تو ان کا پیر کبیر کے سر پر پڑ گیا اور بے ساختہ ان کے منھ سے رام رام نکل گیا۔ کبیر خوش ہو گئے کہ منتر مل گیا اور اس دن سے اپنے آپ کو رامانند کا چیلا کہنے لگے۔ ہندو اور مسلمان دونوں نے شور مچایا لیکن کبیر کے ماتھے پر بل نہیں پڑا کیوں کہ وہ بچپن سے اس کے عادی تھے۔ ان کے غیر متعصب رویے کی وجہ سے ہندو لڑکے انھیں مسلمان اور مسلمان لڑکے ہندو سمجھ کر چھیڑتے اور ستاتے تھے

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں
دیکھ اے چشم عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ فطرت کو بھی ہے ناز وہ انسان ہوں میں

(اقبال)

بہرحال رامانند نے کبیر کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کبیر ان

کی صحبت میں ایک عرصے تک رہے لیکن بعض لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ صحبت بہت مختصر تھی، اور اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ کبیر کے تصورات پر رامانند کے اثرات آہستہ آہستہ دھندلے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح رامانند سے ملنے سے پہلے کبیر ادھر اُدھر گھومتے رہے اسی طرح ان کی شاگردی اختیار کر لینے کے بعد بھی دوسرے سنیاسیوں اور بھگتوں کے علاوہ مسلم صوفیا کی صحبت میں وقت گزارتے رہے۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ کبیر کی مذہبی معلومات، جو حیرت انگیز حد تک وافر ہیں، سوامی رامانند کی گوشٹھیوں (مجلسوں) کی بھی دین ہیں اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ان گوشٹھیوں میں بھی شریک ہوئے جو مسلم صوفیوں اور ہندو سنتوں کے درمیان ہوتی تھیں اور جہاں اسرار و رموز بیان کیے جاتے تھے۔ ہندو دھرم کے علاوہ تصوف اور اسلام سے ان کی گہری واقفیت اور رغبت یہ قیاس آرائی کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ ان پڑھ ہونے کے باوجود، جس کا انھوں نے خود اعتراف کیا ہے، انھیں اچھی علمی صحبت ملی تھی۔ جھوسی کے شیخ تقی کی صحبت کا ذکر کبیر نے خود کیا ہے، چاہے وہ ان کے شاگرد بنے ہوں یا صرف ہم مجلس رہے ہوں۔

ڈاکٹر تارا چند اپنی انگریزی کتاب ''تمدن ہند پر اسلامی اثرات'' میں لکھتے ہیں

> کبیر کی تعلیمات کے انداز بیان کی صورت گری صوفی اولیا اور شعرا نے کی۔ ہندی زبان میں تو انھیں کوئی پیش رو نہ ملا اس لیے وہ جن نمونوں کی پیروی کر سکتے تھے وہ مسلمانوں ہی سے مل سکتے تھے مثلاً فریدالدین عطار کا ''پندنامہ''۔ بابا فرید اور کبیر کی نظموں کے عنوانوں کے تقابل سے یہ امر باوضاحت معلوم ہوتا ہے۔ کبیر نے دوسرے صوفیا کے علاوہ جلال الدین رومی اور شیخ سعدی کا کلام بھی یقیناً سنا ہوگا کیوں کہ ان کے کلام میں ان صوفی شعرا کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

(صفحہ ۲۳۷، اردو ترجمہ محمد مسعود احمد، مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور)

کبیر کی شاعری میں عربی اور فارسی کے سیکڑوں الفاظ ہیں جن میں سے کچھ تو اس وقت کی ہندی میں رائج ہو چکے تھے اور کچھ براہ راست صوفیانہ شاعری سے آئے ہیں۔ ترک دنیا سے انکار اور یوگ بھوگ دونوں کو گھریلو زندگی کا حصہ قرار دینا (نظم ۳۰) اسلامی تصورات سے واقفیت کا ثبوت ہے۔ "فنائے ہستی سے کبیر کا مقصد یہ تھا کہ انسان اپنے حواس اور قوی سے مسلسل آمادہ پیکار ہے۔" (تارا چند، صفحہ ۲۶۱)

کبیر نے اس پیکار کو اس شاندار انداز میں بیان کیا ہے

شمشیر ہاتھ میں لے کر میدان جنگ میں اترو اور اس وقت تک لڑو جب تک جان میں جان ہے۔ دشمن کا سر کاٹ کر اس کا کام تمام کرو۔ پھر مالک کے دربار میں آ کر اپنا سر جھکاؤ۔ بہادر جنگ کے میدان کو دیکھ کر بھاگتے نہیں اور بھاگنے والے بہادر نہیں ہوتے۔ جسم و جان کے رن میں گھمسان کی لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ ہوس، غصہ، غرور اور لالچ مقابلے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ صبر، قناعت اور صداقت کی بادشاہت میں شمشیر کا نام بلند ہو رہا ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ جب کوئی سورما لڑائی سے پیٹھ پھیرتا ہے تو بزدلوں کی فوج پیچھا کر کے بھاگ جاتی ہے۔

صداقت کے متلاشی کی جدوجہد بہت کٹھن ہے۔ ستی اور سورما کے مقابلے میں اس کا عہد دو ریاضت ہے۔ سورما کی لڑائی دو چار گھنٹے چلتی ہے، ستی کی جدوجہد ایک پل میں ختم ہو جاتی ہے، لیکن صداقت کا متلاشی دن رات جنگ کرتا ہے۔ اس کی لڑائی زندگی کے آخری لمحے تک جاری رہتی ہے۔

(نظم ۳۷، بند ۲، ۳، ۴)

انسان کی اس باطنی جدوجہد کا انجام ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ "جس کے دل میں رحم ہے، جو متقی اور پرہیزگار ہے، جو دنیا میں رہ کر دنیا سے اداس رہتا ہے اور دنیا کے ہر ذی حیات کو اپنی طرح جانتا ہے، اس کو وہ لافانی (بھگوان) مل جاتا ہے۔"
(تاراچند، صفحہ ۲۶۱، کبیر، نظم ۶۵)

ڈاکٹر تاراچند نے بہت سی مثالوں سے کبیر اور مسلم صوفیوں، مفکروں اور صوفی شاعروں کے خیالات کی مماثلت ثابت کی ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے

> اس طرح کبیر نے ایک آفاقی راہ والے مذہب کی طرف انسان کی توجہ پھیر دی۔ کوئی ہندو یا مسلمان اس مذہب سے پہلو تہی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ کبیر کے مشن کا تعمیری پہلو تھا۔ لیکن ان کے مشن کا تخریبی پہلو بھی ہے۔ نئے راستے کی تشکیل اس جھاڑ جھنکاڑ کو دور کیے بغیر جس نے قدیم پگڈنڈیوں کو مسدود کر دیا تھا، ناممکن تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کبیر نے بے باکانہ غیظ و غضب اور پُرزور زبان میں ظواہر مذہب کے تمام ساز و سامان پر، جس نے صداقت کو چھپا دیا تھا یا ہندوستان کی جماعتوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا، حملہ کیا۔ ان کے حملے سے نہ مسلمان بچے نہ ہندو۔

(تاراچند، صفحہ ۲۶۷)

ظاہر ہے کہ اس مقام پر ہندو بھگتی اور مسلم تصوف کا سنگم ناگزیر تھا، اسی لیے بعض مقامات پر منصور کی انا الحق کی گونج کے علاوہ، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، کبیر کی تعلیمات پر رومی کے تصورات کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے جسے انھوں نے ہندو بھگتی کے انداز سے پیش کیا ہے۔ وہی جاہ و جلال، وہی بے تابی اور بے قراری جو رومی کی غزلوں کی خصوصیت ہے، کبیر کی شاعری کا جزو اعظم ہے۔ ہندو بھگتی کبیر کو مقام فنا کی سیر کراتی ہے جہاں عجز و انکسار، خضوع اور خشوع ہے، اور مسلم تصوف مقام بقا پر پہنچا دیتا

ہے جہاں قوت، عظمت، جلال اور جمال، بے باکی اور بلند آہنگی کے ڈنکے بج رہے ہیں، کبیر کے الفاظ میں آسمان گرج رہا ہے۔ اگر کبیر کے یہاں یہ تصور موجود ہے جو بھگتی اور تصوف دونوں جگہ مشترک ہے کہ قطرہ یا حباب دریا میں محو ہو جاتا ہے، جیو، فرد، آتما جا کر وجود مطلق (برہمن) میں مل جاتی ہے، تو دوسری طرف یہ تصور بھی موجود ہے، جو رومی کی دین ہے، کہ قطرہ دریا کو کو پی لیتا ہے، آتمن برہمن کو جذب کر لیتی ہے۔ لیکن یہ دوسری بات اتنے صاف الفاظ میں نہیں کہی گئی ہے جس کی مثال رومی کا یہ شعر ہے

بہ زیر کنگرۂ کبریاش مردانند
فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

(ترجمہ بامِ کبریائی کے سائے میں ایسے ہمت والے لوگ کھڑے ہیں جو فرشتے اور پیمبر اور خدا کو بھی شکار کر لیتے ہیں۔) یا اقبال کا یہ شعر جو رومی کی صدائے بازگشت ہے

در دشتِ جنونِ من، جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور، اے ہمت مردانہ

(ترجمہ میرے دشت جنوں میں جبریل ایک حقیر شکار ہے۔ اے ہمت مردانہ، بڑھ کر خود یزداں پر کمند ڈال دے۔)

لیکن کبیر کا عام انداز یہ ہے

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم
چو غلامِ آفتابم ہمہ ساله آفتاب گویم

(ترجمہ میں نہ تو رات ہوں نہ رات کا پجاری کہ خواب آور کہانیاں سناؤں۔ میں تو سورج کا غلام ہوں اور میرا ہر حرف سورج کی طرح روشن ہے۔)

یہ بھی مقام بتا ہے اور اس کی سب سے اچھی مثال کبیر کی اس نظم میں ملتی ہے

جس کی ساری امیجری نور اور نغمے سے بنی ہے

سورج، چاند اور تاروں کے چراغ جل رہے ہیں۔ پریم راگ بیراگ (بے نیازی) کے تال اور سُر پر بلند ہو رہا ہے۔ فضاؤں میں رات دن نوبت بج رہی ہے اور کبیر کہتے ہیں کہ میرا پریتم (محبوب) آسمانوں میں بجلی کی طرح چمک رہا ہے۔ وہاں لمحے بھر کی اور پل بھر کی آرتی کہاں، سارا سنسار رات دن آرتی اُتارتا ہے اور گیت گاتا ہے۔ طبل اور نشان بج رہے ہیں۔ جھلمل جیوتی کی نیلی بہار جگمگا رہی ہے۔ غیب کے گھنٹوں کی آواز آ رہی ہے۔

کبیر کہتے ہیں کہ وہاں رات اور دن اپنے چراغوں کو گردش دے رہے ہیں۔ جگت کے تخت پر جگت کا مالک بیٹھا ہوا ہے۔ سارا سنسار کرم اور بھرم (کام اور مغالطے) میں مبتلا ہے۔ ایسے پریمی جو پریتم کو پہچانتے ہوں کم ہیں۔ اصلی عاشق وہ ہے جو اپنے دل میں پریم (نیاز) اور بیراگ (بے نیازی) کی لہروں کو اس طرح ملا لیتا ہے جیسے گنگا اور جمنا کے دھارے مل جاتے ہیں۔ اس کے دل میں یہ مقدس پانی ہمیشہ بہتا رہتا ہے تب کہیں جا کر جنم اور مرن، موت اور زندگی، کا انت ہوتا ہے۔

دیکھو وجود میں کیسا آرام ہے۔ اس کا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جو وجود کو محسوس کر سکے۔ پریم کی ڈوریاں ہیں اور سکھ کے ساگر کا جھولا ہے جو پینگیں لے رہا ہے۔ لفظ وہاں بادلوں کی طرح گرج رہے ہیں۔ ایک عظیم الشان نغمہ بلند ہو رہا ہے۔ وہاں بغیر پانی کے کنول کھلا ہوا دکھائی دیتا ہے اور کبیر کہتے ہیں کہ من کا بھونرا اس کا رس پی رہا ہے۔

کائنات کے چکر کے دل میں کیسا حسین کنول کھلا ہوا ہے۔ اس کا لطف کچھ سنت ہی اٹھا سکتے ہیں۔ نغمے (شبد) کی گھٹائیں چاروں طرف چھائی ہوئی ہیں اور دل ایک بے کراں سمندر کی مسرت میں ڈوبا ہوا ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ اس سکھ ساگر میں اس طرح ڈوب جاؤ کہ زندگی اور موت کا بھرم (مغالطہ) باقی نہ رہ جائے۔

دیکھو وہاں پانچوں لذتوں (شبد، سپرش، روپ، رس، گندھ) کی پیاس بجھ گئی ہے اور تینوں دکھوں (مادی، روحانی، دیوی) کا بخار اتر گیا ہے۔ یہ عقل و فہم سے بالاتر (اگم) کا کھیل ہے۔ دیکھو تمھارے وجود میں غیب کی چاندنی ہے۔ وہاں زندگی اور موت کی تانیں مسلسل بج رہی ہیں۔ مسرت کی روشنی آسمانوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک ابدی نغمے کی جھنکار سنائی دے رہی ہے اور ترلوک محل (تینوں دنیاؤں کے ایوان) کے پریم باجے بج رہے ہیں۔

زندگی اور موت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ داہنا اور بایاں ہاتھ ایک ہی ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ یہاں محرم راز گونگا ہو جاتا ہے۔ یہ وہ صداقت ہے جو ویدوں اور کتابوں میں نہیں ملتی (صرف محسوس کی جا سکتی ہے)۔

میں نے شونیہ کے (خلاؤں میں معلق) آسن پر بیٹھ کر سادھنا کے ناقابل بیاں رس کا پیالہ پیا۔ اب میں اسرار کا محرم ہوں اور وحدت کے راز کا سمجھنے والا۔ راہ کے بغیر چل کر میں اس شہر میں پہنچ گیا ہوں جہاں کوئی غم نہیں ہے۔ جگدیو کا رحم اور کرم آسانی سے نصیب ہو گیا ہے۔ میں نے دھیان ادھر کے دیکھا تو وہ بغیر آنکھوں کے نظر آ گیا جو لامحدود ہے۔ جسے لوگ نارسائی کی منزل کہتے ہیں۔

یہ مقام غموں سے آزاد ہے۔ یہاں پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے لیکن جس نے غم پایا وہی بے غم ہو گیا۔ یہاں عجب آرام ہے دانش مند وہ ہے جس نے یہ مقام دیکھا ہے۔ دانش مند وہ ہے جس نے اس کا گیت گایا ہے۔

یہ حرف آخر ہے، مگر اس کا مزہ کیسے بیان کیا جائے۔ جس نے مزہ چکھا ہے وہی اس لذت کو جانتا ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ اس سے لذت اندوز ہونے کے بعد جاہل دانش مند بن جاتا ہے اور دانش مند خاموش ہو جاتا ہے۔

اودھوت (جوگی) نشے میں چور ہے۔ گیان (علم) اور ویراگیہ (بے نیازی) کی تکمیل ہو گئی ہے۔ آتی جاتی سانس کا پریم پیالہ اس نے پیا ہے۔ سارا آکاش سنگیت سے بھرا ہوا ہے۔ انگلیوں کی مضراب کے بغیر تاروں سے نغمے نکل رہے ہیں۔ میش اور غم کا کھیل جاری ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ جو کوئی اپنی زندگی کو زندگی کے سمندر میں ڈبو دیتا ہے اس کی روح مہا آنند میں ڈوب جاتی ہے۔

آٹھوں پہر کا متوالا پن ہے۔ آٹھوں پہر جام پر جام چل رہے ہیں۔ آٹھوں پہر سرمستی چھائی رہتی ہے۔ برہم کے جسم میں بھگت زندہ ہے۔

صرف سرور ہی سرور ہے۔ نہ دکھ ہے نہ کشمکش، وہاں میں نے بھرپور آنند دیکھا ہے۔ وہاں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ وہاں صرف وحدت کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔

میں نے اپنے وجود (جسم) میں کائنات کا ہنگامہ دیکھا ہے اور مجھے دنیاوی غلطیوں سے نجات مل گئی ہے۔ خارجی اور داخلی وجود

سے ایک آسمان بن گیا ہے۔ محدود اور لامحدود متحد ہو گئے ہیں۔

میں دیدار کی شراب سے مست ہو گیا ہوں۔ تیرا نور بھرپور
شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ گیان کی تھال میں پریم کا دیا جل رہا ہے۔
شونیہ کے آسن پر سادھنا کا ڈیرا ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ وہاں غلطیوں کا
وجود نہیں اور زندگی اور موت کی کشمکش ختم ہو چکی ہے۔ (نظم نمبر ۱۷)

ڈاکٹر تاراچند نے اس نظم کے بعض حصوں کو معراج روحانی سے تعبیر کیا ہے جو خالص مسلم عقیدہ ہے[۱۰]۔ لیکن اس نظم میں بھی مسلم اور ہندو فکر کی ایسی آمیزش ہے کہ دونوں کے لیے قابل قبول ہو سکتی ہے۔ ''وجود'' اور ''غیب'' جیسے الفاظ کے علاوہ، جو اس وقت کی بول چال کے الفاظ نہیں ہو سکتے، کبیر نے گنگا اور جمنا کو ''گنگ'' اور ''جمن'' کہا ہے جو خالص فارسی تلفظ ہے، یہ براہ راست صوفی شاعروں کی روایت کی شہادت ہے۔ پھر ''دیدار کی شراب'' اور ''عشق کا نور'' بھی مسلم صوفی اثرات کا نتیجہ ہے۔ لیکن ان تصورات کے ساتھ جب کبیر ''شونیہ''، ''ترلوک محل''، ''کائنات چکر''، ''کنول کے پھول''، ''آرتی'' اور ''غیب کے گھنٹوں'' کے تصورات کو ملا دیتے ہیں تو وہ اپنی ہندو وراثت کی نشان دہی کرتے ہیں۔

چوں کہ وحدانیت کے ناپیدا کنار سمندر کی لہریں اپنے الگ الگ نام نہیں رکھ سکتیں، اس لیے کبیر نے ہندو یا مسلم نام اختیار کرنے سے انکار کر دیا

ہندو کہو تو میں نہیں، موسلمان بھی ناہیں
پانچ تتو کا پوتلا، گیبی کھیلے ماہیں

(ترجمہ: میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان، میں غیب کے کھیل میں پانچ عناصر کا ایک پتلا ہوں۔)

اس کے بعد خدا، اللہ، رام ہری، گوبند، سائیں، صاحب، سب الفاظ ہم معنی ہو جاتے ہیں اور ان پر لڑنے والے بے وقوف معلوم ہونے لگتے ہیں۔

رومی نے اپنی مثنوی میں ایک حکایت بیان کی ہے۔ ایک شخص نے چار مختلف زبانیں بولنے والوں کو ایک درم دیا۔ ایرانی نے کہا کہ اس سے انگور خریدے جائیں۔ عرب نے کہا نہیں، عنب۔ ترک نے ازم کا نام لیا اور چوتھے نے استافیل کا۔ اس پر چاروں لڑنے لگے۔ اس وقت اگر کوئی چاروں زبانوں کا جاننے والا موجود ہوتا تو وہ ان بے وقوفوں کو بتاتا کہ سب ایک ہی چیز مانگ رہے ہیں، لڑائی صرف الفاظ پر ہو رہی ہے۔

اس مثنوی میں دوسری جگہ رومی نے چراغوں اور پھلوں کی تشبیہ استعمال کی ہے۔ اگر ایک مکان میں دس چراغ جمع کر دیے جائیں تو ہر ایک کی شکل دوسرے سے الگ ہوگی لیکن جب نور پر نظر جائے گی تو کوئی فرق نہیں معلوم ہوگا۔ اسی طرح اگر سو سیب اور سو بہی کا شمار کیا جائے تو سو نظر آئے گا لیکن نچوڑ دینے کے بعد سب کا رس ایک ہو جائے گا۔ دراصل معنی میں گنتی اور تقسیم ممکن نہیں ہے اس لیے یاروں کو یاروں سے مل جانا چاہیے۔ درصورت کو چھوڑ کر، جو سرکش ہے، معنی کو اختیار کرنا چاہیے۔ (مثنوی، دفترِ اوّل، ص ۶۵)

یہی بات کبیر کہتے ہیں مگر وہ ان پڑھ ہونے کی وجہ سے رومی کی طرح عالم اور مفکر نہیں ہیں اس لیے وہ عالمانہ تشبیہیں استعمال نہیں کرتے بلکہ زمین کی گری پڑی تشبیہوں سے کام لیتے ہیں اور براہ راست حملہ کرتے ہیں

> دنیا کے دو مالک (جگدیش) [۱] کہاں سے آئے؟ تجھے اس بھرم میں کس نے مبتلا کر دیا ہے؟ اللہ، رام، رحیم الگ الگ کیسے ہو سکتے ہیں؟ ایک سونے سے سب زیور بنائے گئے ہیں۔ یہ سب ایک نماز، ایک پوجا، کہنے سننے کی باتیں ہیں، ان کو اپنے وجود سے دور کر دے۔ وہی مہادیو ہے، وہی محمد۔ جو برہما ہے اسی کو آدم کہنا چاہیے۔ کوئی ہندو کہلاتا ہے اور کوئی مسلمان لیکن رہتے ایک زمین پر ہیں۔ ایک

ویدکی کتابیں پڑھتا ہے اور ایک خطبہ، ایک مولانا کہلاتا ہے اور ایک پنڈت۔ نام الگ الگ رکھ لیے ہیں، ویسے برتن سب ایک ہی مٹی کے ہیں۔ (نظم ۱۲۶)

رومی نے اپنے اشعار کو یہ عنوان دیا ہے کہ "اس بیان میں کہ تمام پیغمبر برحق ہیں، جیسا کہ قرآن کی آیت ہے کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے"۔ لیکن کبیر نے یہ عبارت لکھے بغیر اسی جذبے کی ترجمانی کی ہے۔ "اگر ان کے کلام میں صوفیوں کی اصطلاحات سے زیادہ مطابقت نہیں پائی جاتی تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ کبیر ان خیالات سے کم آگاہ تھے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عالم فاضل نہیں تھے۔ اس لیے جب انھوں نے ان تصورات کو اپنایا تو فارسی شعروں کو مکمل طور سے اپنے ذہن میں محفوظ نہ رکھ سکے۔" (تاراچند، صفحہ ۲۴۹)

مسلمان صوفیا رسول اسلام کا نام لینے کے معاملے میں بہت محتاط ہیں۔ ان کا یہ اصول ہے کہ "با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار۔" کبیر سے پہلے رومی بعض مقامات پر اُن حدوں سے تجاوز کر گئے ہیں جہاں تک جانے کی ہمت اس سے کمتر درجے کے صوفی اور شاعر نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ایک غزل میں وہ بہت سے پیغمبروں کے نام لیتے ہیں اور پھر اشارے میں رسول اللہ کا ذکر کر کے یہ کہتے ہیں کہ رومی نے کوئی کفر کی بات نہیں کی ہے۔ یہاں صرف چند اشعار کافی ہوں گے

ہر لحظہ بشکلِ بت عیار برآمد — دل بُرد و نہاں شد
ہر دم بہ لباسِ دگر آں یار برآمد — گہ پیر و جواں شد
خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ — خود رندِ سبوکش
خود بر سرِ آں کوزہ خریدار برآمد — بشکست و رواں شد
باللہ کہ ہم او بود کہ می آمد و می رفت — ہر قرن کہ دیدی
تا عاقبت آں شکلِ عرب وار برآمد — دارائے جہاں شد

ہمان کہ ہم او بود کہ می گفت انا الحق　　در صورت الٰہی

منصور نہ بود او کہ بر آں دار برآمد　　ناداں بہ گماں شد

ایں دم بہ نہاں است بہ بیں گر تو بصیری　　از دیدۂ باطن

اینا ست کزو ایں ہمہ گفتار برآمد　　در دیدہ بیاں شد

رومی سخن کفر نہ گفتست و نہ گوید　　منکر مشویدش

کافر شدہ آں کس کہ بہ انکار برآمد　　از دوزخیاں شد [۱۲]

(ترجمہ اس چالاک محبوب نے طرح طرح کی شکلیں اختیار کی ہیں اور دل لے کے غائب ہو گیا۔ ہر بار دوسرا لباس بدل کر آیا، کبھی بوڑھا بنا اور کبھی جوان۔ وہ خود ہی کوزہ ہے، خود ہی کوزہ گر اور خود ہی کوزے کی مٹی اور خود ہی رند۔ پھر خود ہی اس کوزے کا خریدار بن کے آیا اور اسے توڑ کر چلتا بنا۔ قسم خدا کی وہ خود ہی تھا جو ہر زمانے میں آتا رہا اور جاتا رہا، یہاں تک کہ آخر کار وہ ایک عرب کی شکل میں ظاہر ہوا اور دنیا کا شہنشاہ بن گیا۔ وہی تو تھا جس نے خدا کی آواز میں انا الحق کہا۔ وہ جو دار پر چڑھا منصور نہیں تھا، صرف نادانوں کو غلط فہمی ہوئی۔ اس وقت بھی دل کی آنکھ سے دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں، ہر پردے میں وہی چھپا ہوا بول رہا ہے۔ رومی نے کفر کی باتیں نہ تو کبھی کہی ہیں اور نہ کہتا ہے، اس سے انکار نہ کرو۔ جس نے انکار کیا وہی کافر قرار پایا اور دوزخی ہو گیا۔)

وحدت تمام تضادوں کے خاتمے کا نام ہے۔ رومی کے الفاظ میں، وہ جو اور شعر مل کر ایک ہو جاتے ہیں، عاشق ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں، رات اور دن کے پردے اٹھ جاتے ہیں اور چاند اور سورج ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔ عاشقوں اور معشوقوں کا رنگ سونے اور چاندی کی آمیزش کی طرح مل جاتا ہے اور راقمی یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتا ہے کہ علی اور عمر ایک ہیں۔ [۱۳] چناں چہ اس منزل پر بندے اور خدا کا تضاد بھی ختم ہو جاتا ہے، اس لیے کبیر اپنی بعض نظموں میں دونوں کے لیے ایک سا انداز بیان اختیار کرتے ہیں۔

ازل میں وہ اکیلا تھا اور اس کا اپنا وجود ہی اس کے لیے کافی تھا۔ وہ جس کا نہ رنگ ہے نہ روپ ہے، وہ جو بے صفات ہے۔ نہ تو ابتدا تھی نہ ارتقا نہ انتہا، نہ اندھیرا تھا نہ دھندلکا نہ اجالا، نہ زمین تھی نہ ہوا تھی نہ آسمان، نہ آگ تھی نہ پانی، نہ گنگا جمنا اور سرسوتی کے دھارے تھے، نہ سمندر تھا نہ موجیں، نہ گناہ تھا نہ ثواب، نہ وید پران تھے نہ قرآن۔ (نظم ۸۱)

نہ میں دھرمی ہوں نہ ادھرمی، نہ میں قانون کا بندہ ہوں نہ خواہشوں کا غلام۔ نہ میں بولتا ہوں نہ سنتا ہوں، نہ میں عابد ہوں نہ معبود، نہ میں جبر کے قبضے میں ہوں نہ اختیار کے، نہ میرا کسی سے تعلق ہے نہ بے تعلق ہوں، نہ میں کسی سے دور ہوں نہ کسی سے قریب، نہ ہم جہنم جاتے ہیں نہ جنت کا راستہ لیتے ہیں۔ سب کام ہم نے کیے ہیں لیکن ہر کام سے بے نیاز ہیں۔ اس فلسفے کے سمجھنے والے کم ہیں، لیکن جس نے سمجھ لیا وہ مطمئن ہو گیا۔ کبیر نہ تو کسی مت کا پابند ہے نہ کسی مت کا منانے والا۔ (نظم ۷۹)

اس کے بعد کبیر کی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وحدت کے کثرت میں تبدیل ہونے اور تخلیق کائنات سے پہلے، جب وشنو اور شو کا بھی وجود نہیں تھا، میں ذات مطلق (برہم) کے عشق میں مبتلا تھا یعنی اس کے ساتھ ایک تھا (نظم نمبر ۲۹) اور رومی کی طرح یہ بھی دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ سب کچھ میں ہوں کعبہ بھی میں ہوں، کعبے کے بت کدے میں بیٹھنے والا ہر بت بھی میں ہی ہوں اور انجیل اور زبور اور قرآن بھی میں ہوں گا اس لیے کہ:

در عشق نہ جسم و نہ جانم — چیزے نہ غم نہ ایں نہ آنم
افزوں ز زماں و در زمانم — بیروں ز مکان و در مکانم

ہر جا کہ زدم خراب عشقم　　من کعبہ و بت کدہ نہ دانم
ہم سایۂ آفتاب ذاتم　　ہم موج محیط بیکرانم

(ترجمہ عشق میں نہ میں جسم ہوں نہ جان، نہ یہ ہوں نہ وہ۔ وقت سے بڑا ہوں اور وقت کے پیمانے میں سمایا ہوا ہوں۔ مکان (Space) سے بالا ہوں اور مکان میں موجود ہوں۔ جہاں بھی جاؤں میں عشق کا متوالا ہوں۔ میں کعبہ اور بت کدہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں آفتاب ذات (برہم) کا نور ہوں اور ناپیدا کنار سمندر کی موج۔

ان عاشقوں کی ایک ہی منزل ہے، منزل کبریا۔ کبیر کے الفاظ میں "نشانہ آسمان کی اوٹ میں ہے۔ داہنی طرف سورج ہے، بائیں طرف چاند اور نشانہ بیچ میں چھپا ہوا ہے۔ تن کی کمان ہے اور عشق کی ڈوری اور میں نے شبد (صوت سرمدی) کا تیر تان لیا ہے۔" (نظم ۱۲۲) اور رومی کے الفاظ میں:

از کمان شوق تیر معرفت　　راست کردہ بر نشان انداختم

(ترجمہ شوق کی کمان میں معرفت کے تیر کو سیدھا کر کے میں نے نشانے پر مار دیا ہے۔)

اس مقام پر کبیر کی آواز رومی اور دوسرے عظیم صوفی اور سنت شاعروں کی آواز کی طرح صرف وحدانیت کے جذبے سے سرشار ہے (نظم نمبر ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۹۴، ۹۶)۔ اور اس سرشاری کے عالم میں کسی ظاہری رسم یا ظاہری عبادت کی گنجائش نہیں ہے[۱۵]۔ وہ وحدت میں خلل ڈالتی ہے، اور جس کو اس عالم میں عبادت کے رسوم سوچنے کی فرصت مل گئی وہ صحیح معنوں میں سرشار نہیں ہے، اس لیے وہ یا تو دکھاوے میں مبتلا ہو جاتا ہے یا عبادت کے فرق پر اور رسموں کی ظاہری شکلوں پر لڑتا جھگڑتا ہے، جس کی وجہ سے خدا کی مخلوق میں اختلاف پیدا ہوتا ہے اور نفاق کے دروازے کھلتے ہیں

دیکھو سادھو، ساری دنیا پاگل ہو گئی ہے۔ سچی بات کہو تو مارنے کو دوڑتے ہیں لیکن جھوٹ پر ساری دنیا کا ایمان ہے۔ ہندو رام کا نام لیتا ہے اور مسلمان رحمان کا اور دونوں آپس میں لڑتے مرتے ہیں،

لیکن حقیقت سے کوئی واقف نہیں۔ مجھے دھرم اور اس کے قوانین کے ماننے والے بہت ملے جو ہر صبح اشنان کرتے ہیں اور آتما کو چھوڑ کو پتھر کی پوجا کرتے ہیں۔ اُن کا علم اور عرفان جھوٹا ہے۔ میں نے پیر اور مرید بہت دیکھے ہیں جو کتاب اور قرآن پڑھتے رہتے ہیں۔ وہ قبر دکھ کر لوگوں کو مرید بناتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے خدا کو نہیں پہچانا ہے۔ (نظم نمبر ۱۱۷)

اللہ دین کا اول اصول ہے اور اس نے زبردستی کی ہدایت نہیں فرمائی ہے۔ تمھارے پیر و مرشد کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ روزے رکھنے، نماز گزارنے اور کلمہ پڑھنے سے جنت نہیں ملتی۔ کاش کوئی یہ بات جانے کہ ایک دل میں سفر کیجیے ہیں۔ اپنے محبوب کو پہچانو اور دل میں رحم پیدا کرو اور مال و متاع کو حقیر سمجھو۔ بہشت تو تب ملتی ہے جب سائیں کو اپنے پاس محسوس کریں۔ (نظم نمبر ۱۱۸)

اے سادھو، یہ پانڈے بڑے مشاق قصائی ہیں۔ ان کے دل میں ذرا بھی رحم نہیں۔ اشنان کر کے اور تلک لگا کر بیٹھتے ہیں اور بڑی باقاعدگی سے دیوتا کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ اپنی آتما کو ایک پل میں مار دیتے ہیں اور خون کی ندی بہا دیتے ہیں۔ یہ بہت مقدس ہیں اور اونچے خاندان کے ہیں۔ لوگوں کا پاپ کاٹنے کے لیے یہ کتھا سناتے ہیں اور کامرن سے بہت پیسے کرواتے ہیں۔ میں نے دونوں کو ایک ساتھ ڈوبتے دیکھا ہے۔ (نظم نمبر ۱۱۲)

مالا، تلکو، ٹھاکر، پتھر، تیرتھ، سگرے پانی
رام کرشنا مرتے دیکھے، چاروں وید کہانی

کنکر پتھر جوڑ کے، مسجد لئی بنائے
وا چڑھ ملا بانگ دے، کا بہرو بھیو کھدائے

اور اس سب سے کبیر نے ایک ہی نتیجہ نکالا تھا

پوتھی پڑھ پڑھ جگ موا، پنڈت بھیا نہ کوئے
ڈھائی اچھر پریم کے پڑھے سو پنڈت ہوئے

اس میں دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ دیوناگری میں جب "پریم" لکھا جاتا ہے تو اس میں صرف ڈھائی حرف ہوتے ہیں۔

ظاہری مذہب سے بغاوت اور باطنی مذہب کی تبلیغ کا انقلابی پہلو یہ تھا کہ اس نے قرونِ وسطیٰ کے انسان کو خودداری، عزتِ نفس اور خوداعتمادی عطا کی اور انسانوں کو انسانوں سے محبت کرنا سکھایا۔ سنتوں اور صوفیوں کے پاس اتنی طاقت تو نہیں تھی کہ وہ اس ظلم اور بدکاری کے خلاف لڑ سکتے جن کا مرکز شاہی دربار اور امیروں کے محل تھے، اس لیے انھوں نے ان کی طرف سے انتہائی حقارت کے ساتھ منھ پھیر لیا اور صبر و قناعت کی تعلیم دی۔ قناعت کا مقصد ترکِ دنیا نہیں تھا بلکہ بادشاہوں، درباریوں اور امیروں سے بے نیاز ہو کر تجارت اور جسمانی محنت سے روزی کمانا تھا، جس کا نمونہ کبیر نے پیش کیا ہے۔ اس زمانے میں تجارت کو شاہی ملازمت کے مقابلے میں حقیر سمجھا جاتا تھا اس لیے تجارت اور دستکاری کی آمدنی پر قناعت کرنا اور صبر و شکر کی زندگی گزارنا سب سے بڑی قناعت تھی۔ (شبلی نعمانی، "شعر العجم") اور یہ قرونِ وسطیٰ سے جدید صنعتی اور تجارتی عہد کی طرف پہلا قدم تھا اس لیے تصوف اور بھگتی نے جاگیرداری نظام کی فکری بنیادوں کو ہلا دیا۔

کبیر کی تعلیمات نے عام ہندو اور مسلمانوں کو اپنا گرویدہ بنایا لیکن تنگ نظروں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے۔ اس لیے انھوں نے کبیر کے خلاف ہنگامہ برپا کر دیا اور بادشاہِ وقت سکندر لودھی تک شکایت پہنچی۔ یہ تو پتا نہیں چلتا کہ سکندر لودھی

نے نے کبیر کو سزا دی یا معاف کر دیا، لیکن یہ ضرور ہوا کہ کبیر نے کچھ عرصے کے لیے بنارس چھوڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تعلیمات دور دور تک پھیل گئیں۔

ڈاکٹر تاراچند کے الفاظ میں کبیر "پہلا شخص ہے جس نے ایک مرکزی مذہب، ایک سچ کی راہ کا بے باکانہ آگے آ کر اعلان کیا۔ اس کا نعرہ پورے ہندوستان میں گونج اٹھا اور سیکڑوں مقامات سے اس کی آواز بازگشت سنی گئی۔ کبیر کے پیروان مذہب کی تعداد اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنا کہ کبیر کا وہ اثر جو پنجاب، گجرات، اور بنگال تک پھیل گیا اور دور مغلیہ میں بڑھتا گیا۔" ("تمدن ہند پر اسلامی اثرات"، ص ۲۷۰) دوسرے صوفیوں اور سنتوں کی تعلیمات کے ساتھ مل کر کبیر کی تعلیمات اور تصورات شمالی ہندوستان کی تقریباً تمام زبانوں کے ادب میں سرایت کر گئے۔ ان کے براہ راست اثرات کا سراغ گرونانک کی تعلیمات میں بھی ملتا ہے اور آج کے عہد میں ٹیگور کے تصورات میں بھی۔ کسی شاعر کو اس سے بڑا خراج تحسین اور کیا مل سکتا ہے۔

ہمیں آج بھی کبیر کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس روشنی کی ضرورت ہے جو اس سنت صوفی کے دل سے پیدا ہوئی تھی۔ آج دنیا آزاد ہو رہی ہے، سائنس کی بے پناہ ترقی نے انسان کا اقتدار بڑھا دیا ہے، صنعتوں نے اس کے دست و بازو کی طاقت میں اضافہ کر دیا ہے، انسان ستاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے، پھر بھی حقیر ہے، مصیبت زدہ ہے، دردمند ہے، وہ رنگوں میں بٹا ہوا ہے، قوموں میں تقسیم ہے، اس کے درمیان مذاہب کی دیواریں کھڑی ہوئی ہیں، فرقہ وارانہ نفرتیں ہیں، طبقاتی کشمکش کی تلواریں کھنچی ہوئی ہیں، بادشاہوں اور حکمرانوں کی جگہ بیوروکریسی لے رہی ہے، دلوں کے اندر اندھیرے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خود غرضیاں اور رعونتیں ہیں جو انسان کو انسان کا دشمن بنا رہی ہیں۔ جب وہ حکومت، شہنشاہیت اور اقتدار سے آزاد ہوتا ہے تو خود اپنی بدی کا خدا بن جاتا ہے۔ اس لیے اس کو ایک نئے یقین، نئے ایمان اور نئی محبت کی ضرورت ہے، جو اتنی ہی پرانی ہے جتنی کبیر کی آواز، اور اس کی صدائے بازگشت اس عہد کی نئی

آواز بن کر سنائی دیتی ہے:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینے میں بنا لیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں، سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

(اقبال)

یہ کبیر کی، رومی، غرض تمام سنتوں اور صوفیوں کی تعلیمات کی نئی تعبیر ہے جو ایک نئی انسانیت کی بشارت لیے ہوئے ہے۔

سردار جعفری
بمبئی، اگست ۱۹۶۵ء

حواشی

۱۔ کہا جاتا ہے کہ سوامی رامانند کا معتقد ایک برہمن ان سے ملنے آیا تو اس کے ساتھ اس کی بیوہ بیٹی بھی تھی۔ لڑکی کے سوال کے جواب میں رامانند نے اسے ماں ہونے کی دعا دی۔ یہ سن کر برہمن گھبرا گیا لیکن رامانند نے کہا کہ میرے منہ سے نکلا بات نہیں جا سکتی۔ چنانچہ اس بیوہ کے پیٹ سے ایک بچہ پیدا ہوا۔ ماں نے بدنامی کے ڈر سے بچے کو ایک تالاب کے کنارے پھینک دیا۔ اتفاق سے بنارس کا ایک مسلمان جولاہا اپنی بیوی نیما کے ساتھ ادھر سے گزرا۔ وہ دونوں اس بچے کو اٹھا لے گئے اور اس کی پرورش اپنے بیٹے کی طرح کی۔ جب قاضی سے نام رکھنے کی فرمائش کی تو اس نے کبیر کا لفظ کہا۔ اس واقعے کی صحت کے متعلق کوئی تاریخی شہادت پیش نہیں کی جا سکتی لیکن یہ امر یقینی ہے کہ کبیر کی موت کے واقعے کی طرح (جس کا ذکر آگے آئے گا) یہ واقعہ بھی ان کے مذہب میں تعلیم پر زور دیتا ہے۔

۲۔ آٹھویں صدی شنکراچاریہ کی صدی ہے۔ اس پر اختلاف رائے ہے کہ بودھ دھرم کے زوال میں اور اسباب کے علاوہ شنکراچاریہ کا بھی کچھ حصہ ہے یا نہیں۔

۳۔ وہ نئے سماجی جمہوریت سے تھے جس پر اندلس میں عرب کی قبائلی جمہوریت سے اثرات تھے۔ پیغمبر اسلام کی وفات سے قبل ہی عرب کے اندر عرب سماج جب قبائلی منزل سے نکل کر جاگیرداری عہد میں داخل ہو گیا اور جاگیردارانہ شہنشاہیت، اموی اور عباسی خلافت کی سلطنت کی شکل میں ظاہر ہوئی تو اندلس کی جمہوریت، وجود خدا کے سامنے محمود اور ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑا کرنے والی معاشی جمہوریت سے محروم ہونے کی صلاحیت کھو چکی تھی۔ یوں تو سب مسلمان اور محکوم دونوں مسلمان تھے، لیکن اسلام کے نام پر ایک طبقاتی نظام حکومت کر رہا تھا۔ جب حاکم اپنے محکوموں کو اس کا تصور حق نہیں دیتے تھے تو محکوم نئے فرقوں کی شکل میں اپنی تسکین کرتے تھے اور یہ فرقے مذہبی سماج کی شکل اختیار کر جاتے تھے۔ اسلامی ابتدائی صدیوں میں یہ عمل بہت نمایاں ہوتا ہے۔ پہلے ایران اور پھر پورے مشرق وسطیٰ میں نظر آتا ہے اور صوفی تحریک کے نکھرنے میں مدد دیتا ہے۔ ہندوستان میں جو مسلمان فاتح آئے وہ بھی اپنے ساتھ اسلامی

جمہوریت کا تصور لے کر نہیں آئے تھے۔ ان کے پاس ایک جاگیرداری شہنشاہیت کا تصور تھا جس میں حاکم اور محکوم کا فرق نمایاں تھا، خاندانی بزرگی اور شرافت پر زور تھا۔ ہاں وہ جدید مقاصد کے لیے ضرور اسلام کا نام استعمال کرتے تھے۔

۴

"جات جلاہا نام کبیرا، اج ہوں پنچ ناہیں
تہاں جاہو جہاں پاٹ ٹھمر اگر چندن گھس لیناں
آئی ہمارے کیا کرو گی، ہم تو جات کمیناں"

ان دو مصرعوں میں "پاٹ ٹھمر" کا لفظ سب سے زیادہ اہم ہے اور اس کے دو تمام معنی ہیں جو اوپر دیے گئے ہیں۔

(*A Dictionary of Urdu, Classical Hindi and English* by John T Platts)

۵

کافر عشقم، مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگ جان تار گشتہ حاجت زنار نیست

(امیر خسرو)

(ترجمہ: میں وہ کافر ہوں جس نے عشق کو خدا مانا ہے اب مجھے اسلام کی ضرورت نہیں۔ میری ایک ایک رگ تار بن گئی ہے، پھر میں جنیو پہن کر کیا کروں۔)

۶ یہ دلچسپ بات ہے کہ کبیر کا خاندان ہندو سے مسلمان ہوا تھا اور اقبال کا خاندان بھی۔ کبیر نے اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر برہمن پر طنز کیا اور اقبال نے اپنے آپ کو برہمن کہہ کر مسلمانوں کے سامنے فخر و مباہات سے کام لیا۔ "برہمن راز رمز آشنائے رموز و تجربہ است۔" کبیر نے اپنی شاعری میں ہندو تشبیہ اور استعارہ استعمال کیا اور اقبال نے اسلامی روایات سے اپنی تشبیہ اور استعارے لیے، حالاں کہ ان کے فلسفہ خودی پر اپنشد اور ویدانت کا اچھا خاصا اثر ہے جس پر ابھی تک تحقیقی کام نہیں کیا گیا ہے۔

۷ مولانا جلال الدین رومی کے نزدیک وصال الحق انکسار کی آخری منزل ہے۔ جس طرح شہد میں ڈوبی ہوئی مکھی ہل نہیں سکتی اسی طرح استغراق کے عالم میں کوئی صوفی انا العبد (میں بندہ

ہوں) نہیں کہہ سکتا کیوں کہ اس میں دوئی ہے، ایک خدا اور ایک بندہ، اور یہ غرور کی منزل ہے۔ خدا کے وجود کے سامنے اپنے وجود کا اعلان ہے۔ (مثنوی کا انگریزی ترجمہ از نکلسن، ساتویں جلد)۔ لیکن یہ کہنے کا حق صرف اہل باطن کو ہے، اہل ظاہر کو نہیں کیوں کہ اس کی سزا موت ہے جسے اہل باطن حشر عروسی کہتے ہیں اور اہل ظاہر سزا کا نام دیتے ہیں۔

۸۔ کبیر سے پہلے ہندی زبان نے کوئی بڑا شاعر پیدا نہیں کیا۔ ملک محمد جائسی کی تاریخ پیدائش ۱۴۹۰ء ہے اور "پدماوت" کی ابتدا ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سوری کے عہد میں ہوئی جب کہ کبیر کا انتقال ۱۵۱۸ء میں ہو چکا تھا۔ اس لیے مسلم صوفیوں کے ذریعے سے کبیر کے پاس کئی سو برس کی ہندی روایت آئی۔ صوفی حلقوں میں رومی، سعدی، عطار اور حافظ کا کلام عام طور سے پڑھا جاتا تھا اور کبیر کی شاعری میں ان کے اثرات کی شہادتیں موجود ہیں۔

۹۔ تصوف میں سالک کو کئی مقامات سے گزرنا پڑتا ہے۔ انھی میں ایک مقام بقا ہے اور ایک مقام فنا۔ دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ فارسی میں رومی مقام بقا کے شاعر ہیں۔ جس طرح کوئی دوسرا صوفی شاعر رومی کے قریب نہیں پہنچتا اسی طرح کوئی دوسرا سنت شاعر کبیر کے قریب نہیں پہنچ پاتا۔

۱۰۔ قرآن میں آیا ہے کہ ایک رات رسول اللہ آسمان پر تشریف لے گئے۔ مسلم عالموں کی اکثریت یہ مانتی ہے کہ یہ جسمانی تجربہ تھا۔ لیکن بعض عالموں کا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ جسمانی طور سے تشریف نہیں لے گئے تھے بلکہ یہ ایک روحانی تجربہ تھا۔ اس لیے دو اصطلاحیں بن گئی ہیں معراج جسمانی اور معراج روحانی۔

۱۱۔ اصل عربی لفظ اللہ ہے، ایرانیوں نے اس کا ترجمہ خدا کیا، کبیر نے جگدیش اور رام کر دیا۔ اگر خدا قابل قبول ہے تو جگدیش بھی قابل قبول ہو سکتا ہے۔

۱۲۔ اس غزل کا دوسرا شعر فروغ اطہر کے مرتبہ دیوان شمس تبریز (تہران ایڈیشن) میں نہیں ہے۔ مجھے بچپن سے یاد ہے اور افضل اقبال نے اپنی انگریزی کتاب *Life and Work of Rumi* (لاہور ایڈیشن) میں بھی اس شعر کو اسی غزل کا حصہ قرار دیا ہے۔ میرے دریافت کرنے پر انھوں نے پروفیسر نکلسن کا حوالہ دیا۔

۱۳۔ اقتباس از اشعار "مثنوی معنوی" مولانا روم، شبلی نعمانی۔ (مطبوعہ مجلس

ترقی ادب، لاہور، صفحہ ۶۸) شیعوں کو رافضی کہتے ہیں جو حضرت عمر کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے۔ آخر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

۱۴

قاب قوسین و تدلی یا دنی ہر سہ ہیم
بلکہ انجیل و زبور و مصحف و قرآں ہم
عزیٰ و لات و ہبلیا، بعل و طاغوت و صنم
کعبہ و سعی و صفا و مذبح و قرباں ہم

(رومی)

۱۵ دونوں ٹکڑے قرآن کی آیتوں سے لیے گئے ہیں۔

"Permit me not henceforward to know thee thus imperfectly through these messengers. Free me henceforward from dependence upon oratories, images and pictures which purport to represent thee; upon the beauties of nature which reveal thee; and even upon words which speak of thee. It is for thee alone, for thyself, that I yearn. Therefore surrender thou thyself now completely." (*St. John of Cross* by A. Peers, p.48, quoted by Baukey Bihari, in *Sufis, Mystics and Yogis of India*.)

۱۶

Tasavvuf was one of the strongest forces making for active benevolence and service to mankind in the past. Its leading exponents, e.g. Rumi, Hafiz, Attar and Jami, were the master spirits of their times. The ethical system they preached is the highest we can conceive. They believed that virtue is its own reward, and condemned the calculating goodness of the selfish clergy whose piety and devotion were motivated by the desire of reward in the hereafter. More important still, Tasavvuf gave self respect to mankind. During the middle ages when man had been reduced to the position of an abject

slave by despotism, it was mysticism alone that glorified him as divine in origin and gave him hope and confidence. The greatest service of Tasavvuf was that it was the only tolerant system in a world from which tolerance had been ruthlessly outlawed." (*A History of Urdu Literature* by Mohammad Sadiq, Oxford Univeristy Press, p 9)

کبیر بانی

(۱)

موکوں کہاں ڈھونڈھے بندے، میں تو تیرے پاس میں
نا میں دیول، نا میں مسجد، نا کعبے کیلاس میں
نا تو کون کریا کرم میں، نہیں یوگ بیراگ میں
کھوجی ہوئے تو ترتے ملیہوں پل بھر کی تلاس میں
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو،
سب سوانسوں کی سوانس میں

❊

ترجمہ:

اے بندے، تو مجھے کہاں ڈھونڈتا پھر رہا ہے، میں تو تیرے پاس ہی ہوں۔ نہ میں مندر میں ہوں نہ مسجد میں، نہ کعبے اور کیلاش میں۔ نہ کسی ظاہری عبادت میں ہوں نہ یوگ بیراگ میں۔ اگر سچے دل سے کھوجنے والا ہو تو پل بھر کی تلاش میں مل جاؤں گا۔ کبیر کہتے ہیں بھائی سادھو سنو، وہ تو ہر سانس میں موجود ہے۔

حاشیہ:

اسلامی عقیدے میں خدا رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے، تصوف کی روایات میں

اور اردو فارسی شاعری میں اس کی بے شمار مثالیں ملیں گی

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
اک ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

(نامعلوم)

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

(اقبال)

نہ تو اندر حرم گنجی، نہ در بت خانہ می آئی
ولیکن سوے مشتاقاں چہ مشتاقانہ می آئی
قدم بیباک تر زن در حریم جانِ مشتاقاں
تو صاحب خانہ آخر چرا دزدانہ می آئی

(ترجمہ: تو کعبے میں سماتا ہے اور نہ بت خانے میں لیکن اپنے چاہنے والوں کے پاس کتنا خوش ہو کر آتا ہے۔ اور چاہنے والوں کے دل (حریم جان ۔ خلوت خانہ روح) میں نڈر ہو کر قدم رکھ۔ آخر تو اس گھر کا مالک ہے پھر چوروں کی طرح آنے کی کیا ضرورت ہے۔ اقبال ۔)

کبیر کے یہاں بھی یہ تصور عام ہے

"اے دل میں ملنے اور مدینے کیوں جاؤں
مرا محبوب (سوئیر ناتھ) تو میرے پہلو میں ہے
اس سے جان ہو کر اس سے دور رہ کر میں دیوانہ ہو جاتا ہوں
مندر اور مسجد میں عبادت کہاں
ہر قدم پر مکہ ہے، ہر قدم پر کاشی
میری زندگی کا ایک ایک پل مبارک ہے"

(اے کے سین کی انگریزی کتاب "ہندوازم" سے ترجمہ)

اس تصور کی ابتدا اُپنشد اور ویدانت سے ہوئی ہے اور یہ شاعری اور فلسفے کے غیر مذہبی (Secular) تصور کی طرف انسان کا پہلا قدم ہے جس میں مذہبی کتابوں اور عبادت خانوں کو چھوڑ کر انسان نے انسان کی روح کے اندر جھانکنے کی اور اس کی ذات میں دلچسپی لینے کی کوشش کی ہے۔

(۲)

سنتن جات نہ پوچھو نرگنیاں

سادھو برہمن، سادھو چھتری، سادھے جتی سیاں

سادھن میں جیسن کوم ہے، سڑھی بور پچھیاں

سادھے ناؤ، سادھے دھندی، سادھ جات ہے تریاں

سادھن میں رویداس سنت ہیں، سچ رشی سو بھگتیاں

سدو نرت ڈنی ہے ہیں، کچھو نہیں پہچانیاں

❊

ترجمہ

اے سادھو! سنتوں کی ذات کیا پوچھتے ہو۔ (بھگوان کو ڈھونڈنے والے) سادھو برہمن بھی ہیں اور چھتری بھی اور ویش بھی۔ سادھوؤں میں چھتیس ذاتیں اس کو تلاش کر رہی ہیں۔ تلی، راسوں، تنتا، اتھاتا ہے۔ نائی، دھوبی، بڑھئی سب ہی سادھو ہیں۔ نہیں میں سنت رویداس ہیں اور نہیں میں سچے رشی جنہیں لوگ بھگتی سمجھتے ہیں۔ خواہ مخواہ ہندو اور مسلمان دو مذہب بن گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی فرق نہیں۔

حاشیہ

سنت رویداس اصلی نام روی داس ہے۔ کبیر کے گرو سوامی رامانند کے بارہ چیلوں میں

رویداس بھی ایک ہیں جو ذات کے چمار تھے، وہ بھی غالباً کاشی کے رہنے والے تھے۔ ان کی کوئی مکمل کتاب یا مجموعہ نہیں ملتا، لیکن کچھ نظمیں (غالباً چالیس پد) سکھوں کی مقدس کتاب گرو گرنتھ صاحب میں شامل ہیں۔

یہ عجیب اور دلچسپ بات ہے کہ قرون وسطیٰ کی وہ انسان دوست تحریک جس نے پہلی بار انسانی برادری کو ایک سمجھا اور مذہب کو عشق بنا دیا اور جو یورپ میں مسٹی سزم، ایران اور اسلامی دنیا میں تصوف اور ہندوستان کے ہندوؤں میں بھگتی اور چین میں چی ایں اور جاپان میں زن (دھیان کی بگڑی ہوئی شکل) کے نام سے مشہور اور مقبول ہوئی، ایک ایسی تحریک تھی جس کی ظاہری شکلوں پر ان علاقوں کے مذہب کا رنگ چڑھا ہوا تھا لیکن اندرونی طور سے، یعنی اپنے معنی اور مقصد کے اعتبار سے، ایک تھی، شروع سے آخر تک اس عہد کے دستکاروں کے ہاتھوں میں رہی، عیسائی مسلک پال خیمہ دوز تھے، منصور حلاج بزاز تھے اور خود کبیر جلاہے تھے۔

ایک عیسائی نے حضرت عیسیٰ کو بھی دستکاروں کے زمرے میں شامل کر دیا ہے

''وہ ہاتھ جو رحمت خداوندی بن کر لوگوں کے سروں پر سایہ فگن ہوتے تھے، جو نابینا آنکھوں کو بینائی عطا کرتے تھے اور جذامیوں کو اچھا کر دیتے تھے، جن کی ہتھیلیاں صلیب پر زخمی ہو گئی تھیں، وہ ہاتھ محنت سے چور اور پسینے سے تر ہو چکے تھے، وہ کیلیں ٹھونکنا جانتے تھے۔ وہ ایک سادہ محنت کش کے ہاتھ تھے۔ حضرت عیسیٰ نے انسانی روح کو سنوارنے اور نکھارنے سے پہلے مادے کو اپنے ہاتھوں سے سنوارا تھا۔''

(Giovanni Papini, *Life of Christ*)

ڈاکٹر رادھا کمد مکرجی نے اپنی انگریزی کتاب ''ہندو سویلیزیشن'' (مطبوعہ بھارتیہ ودیا بھون، بمبئی، جلد ا، صفحہ ۱۵۵) میں ہندوستان کی مختلف جاتیوں اور ورنوں کے فرائض بیان کیے ہیں ''براہمن تعلیم دینا، قربانی اور مذہبی رسوم ادا کرنا، دان یا خیرات وصول کرنا، چھتری (کشتری) حفاظت اور حکومت کرنا، ویش تجارت اور کھیتی کرنا، جانور

پالنا، بینکنگ، شودر سچائی، صفائی، انکسار، آچمن منتر کے بغیر اشنان، لاشیں اٹھانا اور جلانا، اپنی ہی جاتی میں شادی کرنا، اونچی جاتیوں کی خدمت کرنا اور شلپ ورتی یعنی دستکاری کرنا، نائی، دھوبی، مصور، بڑھئی، لوہار کا پیشہ اختیار کرنا۔''

ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ سماج کی ترقی، جاگیرداری کے زوال اور تجارت اور ابتدائی سرمایہ داری کی نشوونما کے ساتھ ساتھ ویش اور شودر کا درجہ بڑھ گیا کیوں کہ تجارت، کھیتی، جانور پالنا اور بینکنگ ویش کے ہاتھوں میں تھی اور تمام دستکاریاں شودر کے ہاتھ میں۔ بھگتی کی تحریک کے ساتھ ساتھ شاعری اور فلسفے بھی، جو برہمنوں کی میراث تھے، دستکاروں تک پہنچ گئے۔ اس کا آخری اور بڑا شاعر اور مفکر کبیر ہے۔

گرنتھ رشی کبیر پنتھی گرنتھوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ کلجگ کی ابتدا میں جب کبیر صاحب کا ظہور ہوا تو کاشی (بنارس) کے نندرشن نامی مہاتما نے کبیر سے دیکشا (شاگردی) لی۔ وہ ذات کے بھگتی تھے۔ پنڈت ہزاری پرشاد دوبے ویدی نے اپنی ہندی کتاب ''کبیر'' میں لکھا ہے کہ مہابھارت کی لڑائی جیت لینے کے بعد یدھشٹر نے بھائیوں اور عزیزوں کا خون کرنے کے گناہ سے نجات پانے کے لیے ایک بہت بڑا یگیہ کیا۔ سری کرشن نے اس یگیہ میں ایک گھنٹہ باندھ دیا اور کہا کہ جب گھنٹہ سات بار بجے تو سمجھنا چاہیے کہ گناہ سے نجات مل گئی۔ ہزاروں سادھو اور براہمن بھوجن کر چکے مگر گھنٹہ نہیں بجا۔ تب کرشن جی کی ہدایت پر بھیم کاشی کے نندرشن بھگتی کو بلانے گئے۔ بھیم کے غرور کی وجہ سے نندرشن نے آنے سے انکار کر دیا۔ تب یدھشٹر خود جا کر انھیں بلا لائے اور بھوجن کرایا۔ ان کے بھوجن کرنے پر گھنٹہ بجا۔ پھر سب لوگ کرشن جی کے کہنے پر پریاگ (الہ آباد) گئے۔ وہاں سنگم کے پانی میں سب نے اپنا اپنا عکس دیکھا۔ صرف نندرشن بھگتی کا عکس انسان کا تھا، باقی سب کے عکس کتے اور دوسرے جانوروں سے ملتے تھے۔

سنتوں کی کوئی ذات نہیں ہوتی، اس خیال کو صوفیۂ فکر نے اس طرح ادا کیا ہے

بندۂ عشق شدی، ترک نسب کن جامی

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

(ترجمہ: اے جامی، اب عشق کی غلامی اختیار کی ہے تو باپ دادا کا نام بھول جاؤ، کیوں کہ اس راستے میں یہ بات کہ فلاں فلاں کا بیٹا ہے بے معنی ہے۔)

باز می گویم و از گفتۂ خود دل شادم

بندۂ عشقم و از ہردو جہاں آزادم

(ترجمہ: میں یہ بات پھر دہرا رہا ہوں اور اس بات سے خوش ہوں کہ میں عشق کا غلام ہوں اور دونوں جہان کی پابندیوں سے آزاد ہوں۔ حافظ شیرازی)

(۳)

سادھو بھائی، جیوت ہی کرو آسا

جیوت سمجھے، جیوت بوجھے، جیوت مکتی نواس

جیوت کرم کی پھانسی کاٹے، موئے مکتی کی آسا

جو جیوے جو ہی کہت ہے، سو سب جیوتی آسا

اب ہوں ملا تو سب نوں ملیے گا، نہیں تو جم ڈر ہاسا

ست کہے سب گرو کو جیہیں، ست نام وسواسا

کہیں کبیر سادھ بلکاری، یہ سادھن کے داسا

ترجمہ

میرے بھائی، اب تک زندہ ہوتے تک امید رکھو۔ مکتی بوجھ زندگی کے ساتھ ہے۔ نجات بھی زندگی ہی میں ممکن ہے۔ اگر تم نے زندگی میں اپنے بندھن نہیں توڑے (کرم کا پھندا نہیں کاٹا) تو مرنے سے نجات کی کیا امید رکھتے ہو۔ یہ ایک خیال عام ہے کہ روح تن سے نکل کر بھٹکوں سے مل جائے گی۔ اگر وہ اب ملا تو تب ملے گا، نہیں تو موت کی گھڑی میں پتا چلے گا۔ ست (صداقت) کو آج گرفت میں لو، ست گرو کو آج پہچانو، ست نام پر آج یقین کرو۔ کبیر کہتے ہیں کہ ہم تو تلاش اور جستجو

کے جذبے کے غلام ہیں، کیوں کہ آخر میں یہی جذبہ کام آتا ہے۔

حاشیہ:

کرم کی پھانس تمام مذاہب میں یہ عقیدہ عام ہے کہ اخلاقی قوانین خدا یا دیوتاؤں کے بنائے ہوئے ہیں اور ان پر عمل کرنا انسان کا فرض ہے۔ اخلاقیات کے اس تصور میں پہلی بنیادی تبدیلی گوتم بدھ (پانچ سو قبل مسیح) نے کی جن کی تعلیم میں اخلاقی قوانین خود انسان بناتا ہے اور ان کو اپنے اوپر عائد کرتا ہے۔ جان نہ لینا، خواہش سے بچنا، جھوٹ اور نشے سے پرہیز کرنا، یہ سب خود اختیاری فرائض ہیں جن سے کوئی ثواب نہیں ملتا بلکہ شعور اور چیتنا پر جلا ہوتی ہے یا وہ پردے اٹھ جاتے ہیں جو شعور اور چیتنا پر پڑے ہوئے ہیں۔ ان فرائض کو ادا کرنا یا ان پر عمل کرنا اچھا کرم ہے اور اس کے مقابلے پر برا کرم ہے، اور دونوں سے عمل در عمل کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو لامتناہی ہے۔ لیکن ہر کرم، چاہے وہ اچھا ہو یا برا، ایک طرح کا الجھاؤ ہے، انسان کی گردن میں پڑی ہوئی رسی ہے جو اسے عمل اور ردعمل کے لامتناہی سلسلے میں کھینچے لیے جا رہی ہے۔ اسی کو کبیر نے "کرم کی پھانسی" (پھانس) کہا ہے۔ اس لیے بدھ گیان کی اعلیٰ منزلوں میں اپنے آپ کو اچھے اور برے دونوں طرح کے کرم کے پھندوں سے آزاد کر لینا شامل ہے۔ یہاں سے مراقبہ کی منزلیں شروع ہوتی ہیں۔ بھگتی تحریک پر اور سنت کویوں کے یہاں بدھ دھرم کے اس اخلاقی نظریے کی پرچھائیں اکثر مل جاتی ہے۔ اس خیال کو کبیر نے نظم ۶ میں اس طرح پیش کیا ہے کہ عمل صرف گیان حاصل کرنے کے لیے ہے۔ گیان حاصل ہو جانے کے بعد عمل اسی طرح بے کار اور غیر ضروری ہو جاتا ہے جس طرح پھل آ جانے کے بعد پھول کی ضرورت نہیں رہتی۔

اس نظم کا ایک پہلو اور بھی ہے جو کسی حد تک محدود ہے۔ اس میں شیخ سعدی اور اقبال، کبیر کے ہم خیال ہیں:

تو کار زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

(سعدی)

(ترجمہ کیا تو نے زمین کا کام سنوار لیا ہے جو آسمان کی طرف پرواز کر رہا ہے؟)

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بُری ہے مستیِ اندیشہ ہائے افلاکی

(اقبال)

(۴)

باگوں باغوں سے باغ سری کنا میں گل عذار

سہس کنول پر بیٹھ کے ہو دیکھے روپ اپار

ترجمہ:

ارے باغوں میں کیا مارا مارا پھر رہا ہے، خود تیرے وجود میں گلزار ہے، ہزار پنکھڑیوں کے کنول (دل) پر بیٹھ کر تو حسن مطلق کا لامتناہی جلوہ دیکھ سکتا ہے۔

حاشیہ:

سہس کنول (سہس = ہزار) ہزار پنکھڑیوں کا کنول۔ ماہر رش زمر (Heinrich Zimmer) نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے۔ تخلیق، تجربہ اور تخلیق نو کا ازلی اور ابدی عمل جاری ہے۔ وہ مجسم رش، وہ سرچشمہ حسن و جمال، حسن مطلق ہے۔ وشنو کہتے ہیں اور وہ کائنات (Cosmos) کے اصول اول، سیال پانی کی تاریک تہ پر تیر رہا ہے۔ جب اپنے لطف و کرم سے، اپنی خوشنودی کی خاطر، آفاق (Universe) کو پھر سے تخلیق کرنا چاہتا ہے تو اس کی ناف سے ایک تنہا کنول باہر نکلتا ہے جس میں خالص سونے کی ہزار پنکھڑیاں سورج کی آب و تاب سے جگمگاتی ہیں اور یہ خلق آفاق کنول کے ساتھ

ساتھ برہما کو بھی باہر نکالتا ہے جو کنول کے بیچوں بیچ بیٹھا ہوا تخلیقی طاقتوں کے نور سے جگمگا رہا ہے۔

یہ برہما ایک ایسا یوگی ہے جسے اپنے اوپر اور کائنات اور آفاق کی طاقتوں پر پورا پورا قابو ہے۔ جب کوئی انسان اپنی تپسیا سے روحانی طور پر اعلیٰ مقام حاصل کر لیتا ہے تو وشنو اس کا اعتراف کرتا ہے اور وہ شخص بھی جلیل القدر یوگی ہو جاتا ہے اور تخلیق کائنات و آفاق کے اس منبع سے منکشف ہو، حسن کنول پر بیٹھ کر لامحدود حسن (روپ اپار) کا جلوہ دیکھ سکتا ہے۔

کبیر کے دوہے کی معنویت یہیں تک ہے، لیکن یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ برہما کے کنول کو رمین کا ہیولیٰ بھی مانا جاتا ہے جو خود رمین کی دیوی دھرتی ماتا ہے۔ ہندو علامیات (Iconography) اور اساطیری نشانات (Mythological symbols) کے اعتبار سے ان کنول کی پنکھڑیوں کی اوپری سطح پر وہ سرزمینیں آباد ہیں جن تک رسائی ممکن نہیں۔ پنکھڑیوں کی نچلی پشت پر سانپوں اور جنوں (یکش) کی بستیاں ہیں اور اس پھول کے دل (وسط) میں وہ براعظم ہے جس کا ایک حصہ بھارت ورش ہے۔

ایک اور علامت = کائناتی گہرائیوں (Cosmic Abyss) میں بھرے ہوئے تاریک پانیوں پر زمین اس طرح تیرتی ہے جیسے شعور کے تاریک سمندر میں شعور کا جگمگاتا ہوا کنول تیر رہا ہو۔ یہ کنول تخلیق کا راز، وہ کائنات کی کوکھ ہے۔ یہ تخلیقی اصول کی پہلی پیدائش ہے۔ اس کے دل سے برہما پیدا ہوتا ہے۔ کبھی پانی عورت ہے اور کنول تخلیقی عضو اور کبھی خود کنول دھرتی ماتا اور نمی کی دیوی ہے۔

ویدوں کی ابتدائی روایت میں کنول کی دیوی کا ذکر نہیں ہے۔ آریوں نے بعد میں اسے قدیم ہندوستان کے غیر آریائی باشندوں کی عوامی تہذیب اور عوامی روایات سے اخذ کیا اور اسے شری اور لکشمی کے ناموں سے یاد کیا۔ لکشمی، جو دولت کی دیوی

ہے، کنول کی علامت رکھتی ہے، اس لیے اس کو کنول کی بیٹی "پدم سنبھوا" کہا گیا ہے زمانۂ ماقبلِ تاریخ کے قدیم غیر آریائی ہندوستان میں وہ چاول اور دھان کی دیوی ہے۔ اب وہ ہندوستانی دیومالا کی سب سے زیادہ محبوب، مقبول، پیاری اور ہر دل عزیز دیوی ہے جو تصویروں میں کنول کے پھول پر کھڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی اس کے بازو سے کنول کا پھول اور اس کا ڈنٹھل زیور کی طرح لپٹا ہوتا ہے۔ بدھ آرٹ میں کنول پر بیٹھے ہوئے بھگوان بدھ یا اپنے ہاتھوں میں کنول کا پھول لیے ہوئے بودھی ستو — پدم پانی — زمانۂ ماقبل تاریخ کے قدیم ترین ہندوستان کی روایت سے اپنا روحانی رشتہ جوڑ رہے ہیں۔

کبیر کے اس شعر میں جو خیال ہے وہ فارسی اور اردو کے شعرا کے یہاں بھی عام ہے اور صوفی روایات سے آیا ہے جن پر بھگتی اور ویدانت کا اچھا خاصا اثر ہے

اے تماشا گاہِ عالم روے تست
تو کجا بہر تماشا می روی

(ترجمہ: ساری دنیا تیرے چہرے کا تماشا دیکھتی ہے۔ تو خود کہاں تماشا دیکھنے جا رہا ہے۔ سعدی)

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ، درِ دل کشا، بہ چمن درآ

(ترجمہ: کیسے ستم کی بات ہے کہ ہوس تجھے باغوں کی سیر کے لیے کھینچے لیے جا رہی ہے۔ تو تو خود ایک کھلتا ہوا پھول ہے، دل کے دروازے کو کھول کے اپنے باغ میں داخل ہو جا بیدل)

دنیا کے تمام مذاہب میں اس خیال کی بنیادی وحدت کی طرف ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے

جب ہندو اتر آتما کی بات کرتے ہیں، اور بدھ نرواں خود بدھ

کی بلندی تک پہنچنے کے امکان کو تسلیم کرتے ہیں، اور یہودی یہ اقرار کرتے ہیں کہ انسانی روح خدا کا چراغ ہے، اور جب عیسائی یہ اعلان کرتے ہیں کہ خدا کی بادشاہت تمھارے وجود کے اندر ہی ہے، کیا تمھیں یہ نہیں معلوم کہ معبد خداوندی اور روح خداوندی تمھارے سینے میں ہے، اور جب پیغمبر اسلام یہ فرماتے ہیں کہ خدا ہماری رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے، تو یہ سب مختلف طریقوں سے ایک ہی بات کہتے ہیں اور وہ یہ کہ الوہیت کوئی بیرونی جابرانہ طاقت نہیں ہے، خدا کوئی سلطان نہیں ہے، بلکہ وہ روحانی اور اندرونی اصول ہے جو خودی میں پیوست ہے۔ یہ اندرونی روشنی (انتہ جیوتی) ہے۔ ہم سب الوہیت کی چنگاریاں ہیں اور خدا کے ساتھ خدا کی طرح تخلیق کے عمل میں مصروف ہیں، اور ہمارا فرض ہے کہ ہم حالات کے مقابلے میں جدوجہد کریں تاکہ بدی اور ناانصافی اور ناہمواری کو ختم کرکے انسانی زندگی کے معیار کو بلند کریں۔

(۵)

اودھو مایا تجی نہ جائی

گرہ تج کیے بستر باندھا، بستر تج کیے پھیری
کام تجے میں کرودھ نہ جائی، کرودھ تجے میں لوبھا
لوبھ تجے اہنکار نہ جائی، مان بڑائی سوبھا
من بیراگی مایا تیاگی، شبد میں سرت سمائی
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو، یہ گم لیلے پائی

❁

ترجمہ:

اودھو، مایا کو تج دینا کتنا مشکل ہے۔ گھر کو چھوڑ کر جو گیا بھیس بنایا، اسے بھی چھوڑا تو پھیری کے فقیر بن گئے۔ خواہشوں سے نجات حاصل کی تو غصہ باقی رہ گیا، اور غصے کو چھوڑا تو لالچ نے آگھیرا، لالچ کو تج دیا تو غرور نے سر اٹھایا۔ جب مایا کو تیاگ کر من بیراگی ہو جاتا ہے تب بھی لفظوں کا پھیر باقی رہتا ہے (یعنی شاستروں میں الجھا رہتا ہے)۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہے کہ نجات کا راستہ (گم = رہس = بھید) کم ہی لوگوں کو مل سکتا ہے۔

حاشیہ:

اودھوت = اودھوت لفظی معنی ہیں وہ جس کی بیوی نہ ہو، یعنی علائق دنیا سے آزاد۔ کبیر نے یہ لفظ ناتھ پنتھی جوگیوں کے لیے استعمال کیا ہے جن کی کبیر کے نظام فکر میں اچھی خاصی مان دان ہے۔ سہج اوستھ (فطری انداز) پراپت (حاصل) کرنے پر سادھک سادھنا کرنے والا اودھوت بن جاتا ہے۔ "اے میرے چت وہاں چل کر وشرام کر جہاں سورج اور چاند کی بھی رفتار نہیں ہے، جہاں ابتدا بھی نہیں اور انتہا بھی نہیں اور وسط بھی نہیں، جنم بھی نہیں، مرن بھی نہیں، اپنا بھی نہیں، پرایا بھی نہیں، جو مہا سکھ ہے، جو سہج اوستھا ہے۔" (دیکھیے نظم ۴۱)

(٦)

چندا جھلکے یہی گھٹ ماہیں
اندھی آنکھیں سوجھے ناہیں
یہی گھٹ چندا یہی گھٹ سُور
یہی گھٹ گاجے اَن حد تُور
یہ گھٹ باجے طبل نِسان
بہرا شبد سنے نہیں کان
جب لگ میری میری کرے
تب لگ کاج ایکو نہیں سرے
جب میری ممتا مرجائے
تب لگ پربھو کاج سنوارے آئے
گیان کے کارن کرم کمائے
ہوئے گیان تب کرم نسائے
پھل کارن پھولے بن رائے
پھل لاگے پر پھول سُکھائے

مرگی پاس کستوری باس
آپ نہ کھوجے کھوجے گیاس

٭

ترجمہ:

اس گھٹ (وجود) میں چاند جھلکتا ہے لیکن اندھی آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ اسی گھٹ میں چاند ہے اور اسی گھٹ میں سورج، اور اسی گھٹ میں ابدیت کا ساز چھڑا ہوا ہے۔ اس گھٹ میں نقارے بج رہے ہیں لیکن بہرے کانوں کو کچھ سنائی نہیں دیتا۔ جب تک آدمی میری میری کرتا رہتا ہے کوئی کام نہیں بنتا۔ جب ممتا مر جاتی ہے تب پربھو آ کر کام سنوارتے ہیں۔ عمل کا مقصد صرف علم (عرفان) ہے لیکن جب علم (عرفان) آ جاتا ہے تو عمل بے کار ہو جاتا ہے، جیسے پھول پھل پیدا کرنے کے لیے کھلتا ہے، پھل آنے کے بعد پھول مرجھا جاتا ہے۔ مشک خود ہرن کے ناف میں ہوتا ہے (جس کی خوشبو سے وہ قرار رکھتی ہے) لیکن وہ اس کو اپنے جسم کے بجائے گھاس میں تلاش کرتا ہے۔

حاشیہ

گھٹ، وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مٹی کا برتن، جسم، دل، دماغ، روح، فکر وغیرہ۔ کبیر کا محبوب لفظ ہے۔ (دیکھیے نظم ۸)

(۷)

سادھو برہم الکھ لکھایا
جب آپ آپ درسایا
بیج مدھ جیوں برچھا درسے، برچھا مدھے چھایا
جیوں سہ مدھے شنّ دیکھیے، شنّ انت آکارا
سہ اجپرتے اجپر بیسے، اجپر چھر بستارا
جیوں رہی مدھے کرن دیکھیے، کرن مدھ پرکاسا
پرماتم میں جیو برہم ام، جیو مدھ تم شواسا
شوانت مدھے شبد دیکھیے، ارتھ شبد کے ماہیں
برہم تے جیو، جیو تے میں یوں، بیارا ملا سدا ہی
آپ ہی برچھ بیج انکورا، آپ پھول پھل چھایا
آپ ہی سورج کرن پرکاسا، آپ برہم جیو مایا
اسا کر میں سہ آپے، سواس شبد ارتھایا
سہ اجپر اجپر چھر آپے میں جیو برہم سمایا
آتم میں پرماتم درسے، پرماتم میں جھائیں
جھائیں میں پرجھائیں درسے سکھیے کبیرا سائیں

ترجمہ:

سادھو، جب برہم نے اپنے آپ کو ظاہر کیا تو غیب کو شہود نمودکھایا۔ جیسے بیج میں درخت دکھائی دیتا ہے اور درخت میں سایہ، جیسے آسمان میں خلا (اُس - شونیہ) دکھائی دیتا ہے اور خلا میں سات شکلیں، اسی طرح محمد کی پشت سے محمد کا نطفہ (دراوالور) اور محمد کے دل سے نکل کر محمد کا پھیل جاتا ہے۔ جیسے سورج میں کرن نظر آتی ہے اور کرن میں روشنی، ویسے ہی پرماتما میں جیو اور جیو میں سانس اور سانس میں لفظ اور لفظ میں معنی چھپتے ہیں۔ برہم میں جیو ہے اور جیو میں برہم، دونوں الگ الگ ہیں اور دونوں ایک ہیں۔ وہ خود ہی بیج ہے، خود ہی پیڑ ہے، خود ہی کونپل، خود ہی پھول پھل اور سایہ۔ وہ خود ہی سورج ہے، خود ہی کرن ہے، خود ہی روشنی۔ خود ہی برہم ہے، خود ہی جیو ہے خود ہی مایہ۔ وہ خود ہی حاضر ہے، خود ہی آسمان، خود ہی سانس، خود ہی لفظ، خود ہی معنی۔ وہ خود ہی حد ہے اور خود ہی بے حد اور خود ہی حد اور بے حد سے پرے۔ وہ جو وہ مطلق ہے، وہ برہم اور جیو سے اندر مثل کل ہے۔ آتما میں پرماتما دکھائی دیتا ہے اور پرماتما میں آتما (جیو)، جیو میں پرماتما دکھائی دیتی ہے اور جیو سا میں اس نظارے میں محو ہے۔ (بعض ہندی پنڈتوں کا خیال ہے کہ یہ بیت کا پد (نظم) نہیں ہے۔)

حاشیہ:

جامی ایران سے آخری بڑے شاعر ہیں جو قریب قریب کبیر کے ہم عصر کہے جا سکتے ہیں۔ ان کی شاعری صوفیانہ ہے۔ اس نظم کے ساتھ ان کی ایک غزل پڑھی جائے تو لطف بڑھ جائے گا

حسن خویش از روے خوباں آشکارا کردہ ای
بس بہ چشم عاشقاں آں را تماشا کردہ ای

زآب و گل عکسِ جمالِ خویشتن بنمودہ ای
شمع گل رخسار و ماہ سرو بالا کردہ ای
جرعہ ای از جامِ عشق خود بخاک افشاندہ ای
ذوفنونِ عقل را مجنون و شیدا کردہ ای
گرچہ معشوقی لباسِ عاشقی پوشیدہ ای
انگہ ازخود جلوۂ برخود تمنا کردہ ای
برزخ از زلفِ سیہ مشکیں سلاسل بستہ ای
عالمے را بستۂ زنجیرِ سودا کردہ ای
موکبِ حسنت نہ گنجد در زمین و آسماں
در حریمِ سینہ حیرانم کہ چوں جا کردہ ای
میکنی جای گم اندر عشق، اسم و رسم خویش
آفریں بادہ بریں رسمے کہ پیدا کردہ ای

(ترجمہ: تو نے اپنے حسن کو معشوقوں کے چہروں سے آشکار کیا ہے، اس لیے عاشقوں کی آنکھ سے اس کا تماشا دیکھتا ہے۔ اپنے جمال کا عکس تو نے پانی اور مٹی میں ظاہر کیا اور اسے گل رخسار شمع اور بلند قامت چاند — حسین صورت — میں تبدیل کر دیا۔ اپنے جام عشق سے ایک جرعہ، ایک گھونٹ، زمین پر انڈیل دیا اور ہزاروں فن جاننے والی عقل کو دیوانہ بنا دیا۔ حالانکہ تو معشوق یعنی حسن ہی حسن ہے لیکن تو نے عاشق کا لباس پہن رکھا ہے اور اس کے بعد اپنے حسن کو خود ہی دیکھنے کی تمنا کر رہا ہے۔ تو نے مشک کی طرح مہکتی ہوئی کالی زلفوں کی زنجیریں اپنے چہرے پر باندھ لی ہیں اور اب ایک دنیا کو دیوانگی کی ان زنجیروں میں جکڑ لیا ہے۔ تیرے حسن کا لشکر زمین و آسمان کی وسعتوں میں بھی نہیں سما سکتا، پھر بھی میں حیران ہوں کہ تو نے سینے کے اندر کیسے جگہ بنالی۔ اے جامی، تو نے اس عشق میں اپنا نام اور اپنا کام سب کچھ گم کر دیا ہے۔ اس

رسم عاشقی کا کیا کہنا جو تو نے پیدا کی ہے۔)

سترھویں اور اٹھارویں صدی کے اردو شاعر ولی دکنی نے اس خیال کو ایک شعر میں یوں کہا ہے

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد
طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ

(۸)

اس گھٹ انتر باگ بگیچے، اسی میں سرجن ہارا
اس گھٹ انتر سات سمندر، اسی میں نو لکھ تارا
اس گھٹ انتر پارس موتی، اسی میں پرکھن ہارا
اس گھٹ انتر انہد گرجے، اسی میں اُٹھت فوارا
کہت کبیر سنو بھائی سادھو، اسی میں سائیں ہمارا

*

ترجمہ:

اس گھٹ (وجود) کے اندر باغ کھلے ہوئے ہیں اور اسی میں باغبان (سرجن ہار-خالق) ہے۔ اس گھٹ میں سات سمندر ہیں اور اسی میں نو لاکھ تارے۔ اس گھٹ میں پارس اور موتی ہیں اور اسی میں پرکھنے والے۔ اس گھٹ میں لامحدود ابدیت گرج رہی ہے اور اسی سے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ اس گھٹ میں ہمارا مالک (سائیں) ہے۔

حاشیہ:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

(اقبال)

یہاں کافر اور مومن ہندو اور مسلمان کے معنوں میں نہیں استعمال کیے گئے ہیں۔ مومن صاحب عرفان (سنت) ہے اور کافر بے یقین اور مشکک (ودیا کا شکار)۔

(۹)

ایسا لو نہیں تیسا لو، میں کیہہ بدھی
کنھوں گنبھیرا لو
بھیتر کہوں تو جگ سے لاجے،
باہر کہوں تو جھوٹھا لو
باہر بھیتر سکل سرنتر، جت اجب دوؤ بیٹھا ہو
درشٹ نہ مشٹ پرگٹ اگوچر،
بانی کہا نہ جائی لو

*

ترجمہ:

آہ! میں حرف راز کو کیسے ادا کروں۔ کیسے کہوں کہ وہ ایسا ہے یا ویسا ہے۔ اگر میں کہوں کہ وہ میرے اندر ہے تو سارا جگ شرما جائے اور اگر یہ کہوں کہ وہ مجھ سے باہر ہے تو بات جھوٹی ہو جائے گی۔ اندر اور باہر کی شکلیں ایک دوسرے الگ نہیں کی جا سکتیں۔ شعور اور لاشعور اس کے دو رخ ہیں۔ نہ تو وہ نظر میں سماتا ہے نہ گرفت میں آتا ہے، نہ ظاہر ہے نہ پنہاں، وہ کیا ہے یہ کہنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔

(۱۰)

تو ہیں موری لگن لگائے رے بھکروا
سووت رہی میں اپنے مندر میں
سبدن مار جگائے رے بھکروا
بوڑت رہی نیہو کے ساگر میں
بہیاں پکڑ سمجھائے رے بھکروا
ایکے بچن، بچن نہیں دوجا
نم موسیں بند چھڑائے رے بھکروا
کہے کبیر سنو بھائی سادھو
پران پران لگائے رے بھکروا

*

ترجمہ:

تو نے ہی مجھے اپنے عشق میں جگایا ہے اے فقیر۔ میں تو اپنے مندر میں سو رہی تھی اے فقیر، تیرے لفظوں کے تار بانے نے مجھے جگا دیا۔ میں دنیا کے ساگر میں ڈوب رہی تھی اے فقیر، تو نے میرا بازو پکڑ کر مجھے باہر نکال لیا۔ بات ایک ہی ہے اے فقیر، تو نے مجھے سارے بندھنوں سے چھٹکارا دلا دیا۔ سنو بھئی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ تو نے

میرے دل سے اپنا دل ملا دیا ہے اے فقیر۔

حاشیہ:

سبدن مار جگائے شبدوں (لفظوں) کی مار یا شکتیت کی چوٹ سے جگاتا ہے، صوتِ سرمدی سے بیدار کرتا ہے۔ شکتی میں ایک چیز ہے "شبد سادھنا" (دیکھیے ظم ۵۷)۔ ازل میں آتمن (خودی) برہمن (وجودِ مطلق) میں کھوئی ہوئی تھی جو صبا کھ، صبا آنند ہے۔ وہ مکمل سکوت کا عالم (شونیہ) تھا لیکن جب آتمن برہمن سے الگ ہو کر سنسار میں نیچے اترنے لگی تو اس سفر میں اس کی شکتی یا طاقت کم ہوتی گئی جس کی وجہ سے ایک آواز پیدا ہوئی اور اس آواز کو ویدانت اور یوگ میں شبد (لفظ = نام = کلمہ = Logos) کہتے ہیں۔ نیچے اترتے ہوئے آتمن (خودی) نے طرح طرح کے رنگ اور شکلیں اختیار کرنا شروع کیں اور سنسار میں آ کر مانس (ذہن) اور مایا (مادہ) بن گئیں۔ باوجود اس کے کہ وہ کثیف ہو چکی ہے، اس نے ابھی تک عشق اور پریم کے پیغام کو قبول کرنے کی صلاحیت پوری طرح نہیں کھوئی ہے۔ اس لیے وہ برہمن کی طرح گرو کی رہنمائی میں دوبارہ رجوع کر سکتی ہے اس طرح وہ بلندی کی طرف سفر شروع کرتی ہے۔ اس کو اپنی کھوئی ہوئی طاقت اور شکتی دوبارہ ملتی جاتی ہے۔ اس یاترا میں اسے وہی آواز جسے شبد کہتے ہیں، پھر سنائی دیتی ہے اور اس نغمے پر وہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ رفتار کی تیزی کے ساتھ ساتھ نغمہ بھی بلند ہوتا جاتا ہے۔ یہ خود روح کا نغمہ ہے جسے یوگی "اناہت ناد" کہتے ہیں اور صوفی "صوتِ سرمدی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ (ماخوذ از بانگِ بہاری، "میرا بائی"، مطبوعہ بھارتیہ ودیا بھون، بمبئی)۔ "جو آواز بیرونی کانوں سے سنی جاتی ہے وہ دو چیزوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے لیکن برہمن کی آواز اناہت شبد ہے یعنی وہ آواز یا شبد جو دو چیزوں کے ٹکراؤ کے بغیر پیدا ہوا۔ یہ آواز "اوم" ہے (ہائن رش زمر)۔ میرا بائی نے شبد کو "نام" بھی کہا ہے اور کبیر کے

یہاں بھی، جو انابت نادکو "انہد" کہہ دیتے ہیں، نام کا لفظ کبھی کبھی ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کبیر کے "انہد" میں ایک لطف یہ بھی ہے کہ اگر اس کو "ان حد" لکھا جائے تو اس کے معنی لامحدود اور بے کراں ہو جائیں گے۔ ("حد حد سب کہیں، ان حد کہے نہ کوئے ان حد کے میدان میں سکھ سے کبیرا سوئے")

فارسی کے عظیم صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی (۱۲۰۷ء تا ۱۲۷۳ء) کی مثنوی کی ابتدا میں بھی، جہاں بانسری کو روح کے استعارے کی طرح استعمال کیا گیا ہے، اس تصور کی جھلک ملتی ہے:

بشنو از نے چو حکایت می کند — از جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق — تا بگویم شرح درد اشتیاق
ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش — باز جوید روزگار وصل خویش

(ترجمہ: بانسری سے سنو وہ کیسی (دردناک) کہانی سنا رہی ہے اور (کس اندر سے) اپنے ہجر و فراق کی شکایت کر رہی ہے۔ (وہ کہہ رہی ہے) جب سے مجھے نیستاں سے کاٹ کر الگ کیا گیا ہے، میری آواز سن کر مرد و زن رونے لگتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ سینہ زخمی ہو جائے تاکہ میں درد اشتیاق کا حال بھی کھول کر سنا سکوں۔ ظاہر ہے کہ جو کوئی اپنی اصل سے دور ہو جاتا ہے وہ پھر وصل کی تلاش کرنے لگتا ہے۔)

بانسری آتمن (خودی)، نیستاں برہمن (وجود مطلق)

(۱۱)

نِس دن کھیلت رہی سکھین سنگ
موہ پڑا ڈر لاگے
مورے صاحب کی اونچی اٹریا
چڑھت میں جیرا کانپے
جو سُکھ چاہے تو لَجا تیاگے
پیا سے پِل مِل لاگے
گھونگھٹ کھول انگ بھر بھیٹے
نین آرتی ساجے
کہیں کبیر سنو سکھی موری
پریم ہوئے سو جانے
بِنج پریتم کی آس نہیں ہے
نابک کاحر پارے

❁

ترجمہ:

میں تو دن رات اپنی سکھیوں کے ساتھ کھیلتی تھی اور اب مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میرے

صاحب کی اتاری اونچی ہے اور اس پر چڑھتے ہوئے جی کانپتا ہے۔ (لیکن عشق کا تقاضا کچھ اور ہی ہے) وصل کی لذت کے لیے شرم اور حجاب کو چھوڑنا ہی پڑے گا۔ میں اپنے محبوب (پریتم) سے گھل مل جاؤں گی۔ گھونگھٹ نکھ جائے گا، جسم ہم آغوش ہو جائے گا اور آنکھیں آرتی اتاریں گی۔ سنو میری سکھی، کبیر کہتے ہیں کہ جس نے عشق کیا وہی اس کی لذت کو جانے، جسے اپنے پریتم سے ملنے کی آس ہی نہ ہو وہ کاجل پارے کیا کرے گی۔ (کاجل پارنا ظاہری رسوم ہیں، اصل حقیقت وصال ہے۔)

حاشیہ:

سنت اور بھگت کویوں نے بھگتی کے جوش میں اپنے آپ کو دلہن اور ذات مطلق کو دولھا کی تشبیہ سے یاد کیا ہے۔ یہ تشبیہ صوفیوں کے یہاں بھی مشترک ہے۔ "الاولیاء عروس اللہ ولا یرون عروسا الا صحابہ" یعنی جو اولیا ہیں وہ اللہ کی دلہنیں ہیں اور دلہنوں کو صرف محرم ہی دیکھ سکتے ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی نے اپنی مثنوی میں یہ تشبیہ استعمال کی ہے۔ ہندوستان میں فقیروں اور درویشوں کی ایک قسم "سدا سہاگن" کے نام سے مشہور ہے۔ کبیر نے اپنی ایک نظم میں خدا کو "اپنا ہی دولھا" (لاڈلا دولھا) کہہ کر مخاطب کیا ہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ بھگتی اور صوفی فکر میں یہ استعارہ کہاں سے آیا اور کب سے رائج ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے تانے کرشن بھگتی سے جا ملتے ہیں۔ کرشن صرف وشنو کا اوتار ہی نہیں ہیں، بلکہ پرماتما ہیں جن میں جا کر مل جانے کے لیے تمام انفرادی روحیں، جیو آتمن، بے قرار ہیں، اور یہ بے قرار روحیں عشق کی زبان میں گوپیاں ہیں جن کی تعداد کروڑوں بتائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بندرابن میں کروڑوں گوپیاں نہیں ہو سکتی تھیں، اس لیے یہ روحیں (آتمن) ہیں جو اپنی نجات اور آزادی کے لیے اپنے شوہروں اور بچوں کو چھوڑ کر (یعنی دنیاوی تعلقات کو توڑ کر) بانسری کی

آواز (اناہت ناد = صوت سرمدی) پر کرشن سے جاتی ہیں۔ یہ عشق کی زبان ہے اور اس کا مفہوم روحانی ہے۔ اس کہانی کا مفہوم بھی روحانی ہے جس میں کرشن نے جمنا میں نہاتی ہوئی گوپیوں کے کپڑے چرا لیے یا چھپا لیے ہیں۔ عاشق یا محبوب کے سامنے شرم و حجاب بے معنی ہیں۔ وہاں تو "میں" (انکار = غرور) باقی ہی نہیں رہتا۔ اسی لیے صوفیوں نے یہ کہا ہے کہ اللہ کی بندوں کو صرف تحرم (حرمت = عزت - جیسے حرم سے ...) دیکھ سکتا ہے، اور کبیر بھی یہی کہتے ہیں

جو سکھ چھنے تو کا تی کہے، پیا سے مل ملن کے
کھوٹکھت مول انگ بھر بھیتر، نیں ترتی ساہے

(۱۲)

ہنسا کرو پُراتن بات
کون دیس سے آیا ہنسا، اُترنا کون گھاٹ
کہاں ہنسا سرام کیا ہے، کہاں لگائے آس
اب سی ہنسا چیت سیرا، چلو ہمارے ساتھ
سے سوک وہاں نہی وہاں ہے، نہیں کال کے ترا
جہاں مدن سی پھول رہے ہیں، اُوٹے سو ہم پاس
من بھورا جہوں اُرجھ رہے ہیں، سکھ کی نہ اپھلاس

*

ترجمہ:

اے ہنس، اپنی پرانی کہانی سناؤ۔ تم کس دیس سے آئے ہو اے ہنس اور کس گھاٹ اترو گے؟ تم کہاں آرام کرو گے اے ہنس، اور تمھیں کس کی تلاش ہے؟ اب بھی چیت جاؤ، ابھی سویرا ہے۔ اے ہنس، آؤ ہمارے ساتھ چلو۔ ایک ایسی جگہ جہاں غموں کا نام نہیں، شک اور دکھ کا نشان نہیں، موت کا خوف نہیں۔ وہاں مدن بن پھول رہا ہے (عشق کی بہار چھائی ہوئی ہے) اور انا الحق کی سہانی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ من کا بھونرا مستی میں گونج رہا ہے۔ اس کے بعد کسی اور سکھ کی آرزو نہیں ہے۔

حاشیہ:

ہنس پاکیزگی اور زندگی کے اصلی جوہر کا استعارہ ہے۔ کبیر نے روح (آتمن) کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ سنسکرت اور ہندی کا آخری حرف ساکن نہیں بلکہ متحرک ہوتا ہے اس لیے ہنس = ہنس (ہنسا) لیکن یورپی زبان میں "وا" اور "آ" کا اضافہ آواز دینے کے لیے یا پیار ظاہر کرنے کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔ اس لیے کبیر نے "ہنسا" کہا ہے۔

ہندو صنمیات (Iconography) میں عام طور سے جنگلی ہنس برہما سے وابستہ ہے۔ اندر کی سواری (وا ہن) ہاتھی ہے، شو کی سواری نندی (بیل)۔ اسی طرح برہما کی سواری ہنس ہے۔ بالی کن رش نرسر کی تشریح کے مطابق ہر واہن الوہی ہستی کی حیوانی ہیئت (نمبور) ہے۔ یہ ہے دخ روحانیت کے ذریعے سے حاصل کی ہوئی مکمل ترین آزادی کا نشان (Symbol) ہے۔ اسی لیے ہندو جوگی یا سنت جب بار بار پیدا ہونے کے چکر سے آزاد ہو جاتا ہے تو ہنس کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اسے "پرم ہنس" کہتے ہیں۔

ہر وجود میں مزاج کی دو متضاد کیفیتیں ہوتی ہیں اور ہنس کی زندگی ان دونوں کیفیتوں کی ترجمان ہے۔ وہ پانی پر تیرنے کے باوجود پانی کی فطرت میں اسیر نہیں ہے۔ پانی کی سطح کو چھوڑ کر وہ صاف و شفاف فضا میں بلند ہو سکتا ہے اور فضا میں موسموں کے اعتبار سے وہ شمال اور جنوب جدھر چاہے جا سکتا ہے۔ وہ جہانبان جہاں گشت ہے، خانہ بدوش آوارہ گرد جو زمین کی تاریک پستیوں سے لے کر فضا کی نورانی بلندیوں تک ہر جگہ یکساں اطمینان اور بے پروائی سے گزر سکتا ہے۔ اس لیے ہنس اس الوہی جوہر (Essence) کی علامت ہے جو ہستی کے شکنجوں میں اسیر ہو کر بھی ان سے آزاد رہتا ہے۔ محدود اور لامحدود، فانی اور لافانی، حاکی اور نوری، متغیر اور

غیر تغیر پذیر، سب کے ساتھ اور کسی کے ساتھ نہیں۔

یہ الوہی خودی (آتمن) کائنات (Cosmos) اور آفاق (Universe) کے جسم کے اندر ایک نغمے کی طرح تیرتی ہے، ہر سنت اور جوگی اپنے سانس کے زیر و بم میں یہی نغمہ سنتا ہے اور مست ہو جاتا ہے۔ ہر اندر جاتی ہوئی سانس "ہم ن" ہے (م = ن) اور ہر باہر آتی ہوئی سانس "س - سا" ہے۔ اور ہر ہونے والا جوگی متواتر اور مسلسل "ہم ن - سا" "ہم ن - سا" (ہنسا، ہنسا) سنتا رہتا ہے اور اپنے وجود کی الوہی اصلیت کو پہچاننے لگتا ہے۔

اس اندرونی ہنس کے گیت میں ایک راز اور بھی ہے۔ وہ "ہم ن - سا" "ہم ن - سا" (سا، ہنسا) کے ساتھ ساتھ یہ بھی سنتا ہے "سا - ہم ن" "سا - ہم ن" (سا = وہ، ہم ن = میں) اور اس کا مطلب ہے "وہ میں ہوں۔ جو وہ ہے وہی میں ہوں، "یعنی میں آتمن (الوہی خودی) ہوں، میں وجود مطلق ہوں۔ انا الحق۔ سوہم یا س = انا الحق کی خوشبو، سوہم = سا ہم ن = جو وہ ہے وہ میں ہوں، برہم کے ساتھ جیو کی اتحاد۔ کل کے ساتھ جزو کا مکمل اتحاد۔ اس لیے میں نے منصور کی روایت سے سوہم کا ترجمہ انا الحق کیا ہے۔ دوسری جگہ کبیر نے اس کو "سوہنگ" لکھا ہے۔ نغمے کی مناسبت سے "یا سبد کی سوہنگ تورا" یعنی انا الحق کا ساز بج رہا ہے۔

مدن = کام دیو = عشق کا دیوتا۔

(۱۳)

اں گڑھیا دیوا، کون کرے تیری سیوا
گڑھے دیو کو سب کوئی پوجے، تب ہی لاوے سیوا
پورن برہم اکھنڈت سوامی تا کو نہ جانے بھیوا
دس اوتار نرنجن کہیے سو اپنا نا ہوئی
یہ تو اپنی کرنی بھوگیں، کرتا اور ہی کوئی
جوگی جتی تپی سنیاسی، آپ آپ میں لڑیاں
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو، راگ کہیے سو تریاں

ترجمہ:

اں گڑھ دیوتا، تجھے مورتی کا روپ نہیں دیا جا سکتا، تیری سیوا کون کرے گا۔ ہر یک اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے دیوتا کو پوجتا اور اس کی خدمت کرتا ہے۔ مگر وہ جو مکمل ہے، جو برہم ہے، جو ناقابل تقسیم ہے، اس کا نام کوئی نہیں لیتا۔ یہ لوگ دس اوتاروں کو مانتے ہیں جو من سے گڑھے گئے ہیں لیکن کوئی اوتار وجود مطلق نہیں ہے۔ یہ تو اپنی اپنی کرنی بھوگ رہے ہیں، کرنے والا تو اور ہی کوئی ہے۔ جوگی، تپسوی اور سنیاسی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ جس نے پریم (راگ = رام) کو

دیکھا ہے اسی کی نجات ہے۔

حاشیہ:

ایک ان دیکھے خدائے واحد کا تصور بہت قدیم ہے۔ اگر ایک طرف اُپنشد کی تعلیمات میں، جو کئی صدی قبل مسیح سے شروع ہو جاتی ہیں، یہ تصور موجود ہے تو دوسری طرف عبرانی پیغمبروں نے اس کی تبلیغ کی ہے۔ اس تصور نے زمانۂ قدیم میں انسانی گروہوں کو قبائلی دیوتاؤں کے تصور سے آزاد کر کے وسیع تر انسانی وحدت کی بنیاد ڈالی۔ اسلام کی ساری بنیاد ایک خدائے واحد کی عبادت پر قائم ہے جو لا الٰہ الا اللہ کے چار لفظوں میں سما گئی ہے۔ (قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا' فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے تجازی کا اقبال)۔ اقبال نے اپنی مشہور نظم "شکوہ" میں ایک بند کہا ہے جو کبیر کی نظم کے خیال سے بہت قریب آ جاتا ہے

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں معبود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیوں کر
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

(۱۴)

دریاؤ کی لہر دریاؤ ہے جی
دریاؤ اور لہر میں بھن کویم
اُٹھے تو نیر ہے بیٹھے تو نیر ہے
کہو جو دوسرا کس طرح ہویم
اسی کا پھیر کے نام لہر دھرا
لہر کے کہے کیا نیر کھویم
جگت بھی پھیر جب جگت پر برھم میں
گیان کر دیکھ مال گویم

*

ترجمہ:

دریا کی موج بھی دریا ہے۔ دریا اور موج میں کوئی فرق نہیں۔ لہر اٹھے تو بھی پانی ہے، بیٹھے تو بھی پانی ہے۔ پھر یہ بتاؤ کہ بھید کہاں ہے؟ پانی کا نام بدل کر لہر رکھ دیا تو کیا پانی کھو گیا؟ دل کی آنکھیں ہوں تو دیکھو کہ برھم کے وجود میں ایک دنیا کے بعد دوسری دنیا اس طرح چل رہی ہے جیسے جپ مالا (تسبیح) کے دانے چل رہے ہوں۔

حاشیہ:

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

(۱۵)

جہاں کھیلت بسنت رِتُ راج
جہاں انہد باجا بجے باج
جہوں دس جوت کی بہے دھار
برلاجن کوئی اترے پار
کوٹی کرشن جہاں جوڑیں ہاتھ
کوٹی وشنو جہاں ناویں ماتھ
کوٹی برہمَ پڑھیں پُران
کوٹی مہیش دھریں جہاں دھیان
کوٹی سرسوتی جہاں دھرے راگ
کوٹی اندر جہاں گگن لاگ
سُر گندھرو مُنی گنے نہ جائیں
جہاں صاحب پر گٹے آئے آئے
چوپا چندن اور ابیر
پُہپ واس رس رہیو گمبھیر

ترجمہ

جہاں بسنت یعنی رُت کا راج کھیل رہا ہے، جہاں ابدیت کا ساز بج رہا ہے، چاروں طرف نور کی ندیاں بہہ رہی ہیں، بہت کم لوگ اس کے پار اتر سکتے ہیں۔ جہاں کروڑوں کرشن ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں، کروڑوں وشنو سجدے میں محو ہیں، کروڑوں برہما پُران پڑھ رہے ہیں، کروڑوں شیش گیان میں گم ہیں، کروڑوں سرسوتیاں وینا بجانے میں مصروف ہیں، کروڑوں اندر آسمانوں میں پھیلے ہوئے ہیں، دیوتا گندھرو (ناچنے والے) اور رشی ان کی سنت ہیں، وہاں میرے صاحب نے اپنے آپ کو بے نقاب کیا ہے اور کائنات صندل، عبیر اور پھولوں کی خوشبو میں بسی ہوئی ہے۔

حاشیہ:

ست لوک (عالم ہوت) کا بیان ہے یعنی جو کچھ برہمانڈ (کائنات) میں ہے وہی پنڈ (جسم) میں ہے۔ آدمی خود ہی اپنے گھٹ (وجود) کے اندر یہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔

کرشن ہندوستانی دیومالا کے سب سے مقبول ہیرو اور ہندوؤں کے سب سے زیادہ محبوب دیوتا ہیں اور وشنو کا آٹھواں اوتار سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ دہلی اور اتر پردیش کے مسلمان گھرانوں میں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو گیت کرشن جی کے گائے جاتے ہیں۔ مثلاً "الیلی تچ (رچہ) مان کرے نندلال سے/ سائیں تچ مان کرے نندلال سے" یا "ابیلے نے مجھے دردِ دیا ساتولیا نے مجھے درد دیا۔ نندلال اور ساتولیا دونوں سے مراد کرشن جی ہیں۔ (سندھ کے لیے دیکھیے "رسوم دہلی" از رضوی سید اختر وجوی۔) تقسیم ہند کے بعد یہ گیت پاکستان بھی پہنچ گئے ہیں۔ کرشن بھگتی کے گیت اور نظمیں اردو کے بہت سے شاعروں کے یہاں ملتے ہیں جن میں اکبر زین نامی نظیر اکبر آبادی (اٹھارہویں صدی) اور مولانا حسرت موہانی (بیسویں صدی) کے ہیں۔

کرشن کا نام سب سے پہلے رگ وید میں آتا ہے۔ لیکن وہ کرشن جن کے گرد بھگتی کی شاعری اور فلسفے کا ہالہ ہے، سب سے پہلے چھاندوگ اُپنشد میں ظاہر ہوتے ہیں اور وہاں وہ دیوکی کے بیٹے ہیں۔ پھر ان کا ذکر "مہابھارت" میں آتا ہے اور ان کا وہی نغمہ "بھگود گیتا" ہے جو اپنی شاعری، فلسفے اور روحانیت کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتا۔ یہ نغمہ صدیوں سے ہندستان میں مقبول ہے اور یورپ اور امریکہ کے دانشوروں اور شاعروں نے بھی اس سے اثر قبول کیا ہے۔ عالموں کا خیال یہ ہے کہ "بھگود گیتا" مہابھارت سے بعد کی تخلیق ہے لیکن اب وہ مہابھارت کا حصہ ہے۔ پرانوں میں اور خاص طور سے "بھگوت پران" میں کرشن جی کی زندگی کی جو تفصیلات ہیں وہی سب عوام کے ذہن میں افسانہ بن گئی ہیں جس کی بنیاد پر صدیوں سے ہزاروں اور لاکھوں گیت اور تصویریں بنائی جا رہی ہیں جن کا شمار ہندوستانی آرٹ کے شاہکاروں میں ہوتا ہے۔ "بھگوت پران" کی کہانیاں ہندی میں "پریم ساگر" کے نام سے ترجمہ ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ ہندی کے وہ بہت بڑے شاعروں، میرا بائی اور سورداس کی عظمت کا دارومدار کرشن بھگتی کی شاعری پر ہے۔

کرشن جی یادو نسل سے تھے اور یہ قبیلہ جمنا کے کنارے بندرابن اور گوکل میں گائے پالتا تھا۔ اس زمانے میں متھرا اور بندرابن میں کنس کی حکومت تھی۔

کرشن جی کی پیدائش کا افسانہ اپنی تفصیلات کے بعض اختلافات کے ساتھ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے ایک عظیم پیغمبر حضرت موسیٰ کی پیدائش کے افسانے سے بہت ملتا جلتا ہے۔

کرشن جی کی ماں دیوکی راجہ کنس کی بھتیجی تھیں اور نارد ؤی نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ دیوکی کا بیٹا کنس کی ظالم حکومت کا خاتمہ کر دے گا۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے کنس نے دیوکی کو اپنے محل میں قید کر لیا اور ان کی کوکھ سے پیدا ہونے والے چھ بیٹوں کو قتل کر دیا۔ جب ساتویں بار حمل قرار پایا تو وہ وشنو کا اوتار تھا اور وہ دیوکی کے

[illegible] کی موت [illegible] کے پیٹ میں منتقل ہو گیا۔ اس
بچے [illegible] وشنو کے منفیہ [illegible] سے پیدا ہوئے تھے۔ دیوکی کے آٹھویں بیٹے
کرشن تھے۔ [illegible] کا رنگ اس لیے کالا تھا کہ وہ وشنو کے میدان سے پیدا ہوئے تھے۔
آدھی رات [illegible] کرشن کی [illegible] تو محل کے پہریداروں پر نیند غالب آ گئی اور تمام
دروازے کھل گئے۔ کرشن [illegible] پیدا ہوئے [illegible] بچے [illegible]
[illegible] بچے کے [illegible] پیدا ہوئے [illegible] جس کی
[illegible] پیدا ہوئی تھی۔ [illegible] بچے کو [illegible]
[illegible] کرشن کی پرورش [illegible] اور نند کے گھر میں ہوئی اور اس [illegible]
[illegible] ہوتے ہیں۔ [illegible] نے اپنی [illegible] میں [illegible] جس [illegible]
[illegible] اور [illegible] نظر [illegible] [illegible] کرشن
[illegible] اور [illegible] کو اپنے [illegible] سے [illegible] کرشن اپنے
بھائی [illegible] ساتھ [illegible] میں [illegible] اور [illegible] میں [illegible] معصوم
[illegible] تھے اور [illegible] پھرتے تھے۔ [illegible] میں [illegible] پھرتے تھے
اور [illegible] تھے۔ [illegible] سب سے [illegible] کوئی اور [illegible] تھیں اور
[illegible] کی تخلیق ہوئی ہے۔
[illegible] کرشن [illegible] ساتھ تھے اور [illegible] کی حیثیت
سے [illegible] تھے۔ [illegible] اور [illegible] کے درمیان
[illegible] کرشن نے [illegible] نغمہ "بھگود گیتا" سنایا۔

[illegible] کے [illegible] میں [illegible] کی جگہ مصر کا بادشاہ فرعون ہے جس نے اپنی
[illegible] پیدا ہونے والے بچوں کے قتل کا حکم
[illegible] تھا [illegible] میں [illegible]
[illegible] میں [illegible] حضرت

موسیٰ کی پرورش فرعون کے محل میں ہوئی۔ حضرت موسیٰ کی زندگی میں بھی ایک جنگ ہے جس کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کو لے کر دریائے نیل پر آتے ہیں، دریا کا پانی دونوں طرف ہٹ جاتا ہے اور درمیان میں راستہ بن جاتا ہے جس سے حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لے کر گذر جاتے ہیں۔ لیکن جب فرعون اپنے لشکر کے ساتھ اس راستے سے گزرنے کی کوشش کرتا ہے تو دونوں طرف سے پانی کے دھارے آ کر مل جاتے ہیں اور فرعون اپنے لشکر سمیت دریائے نیل میں غرق ہو جاتا ہے۔

وشنو ہندو تثلیث (تری مورتی) کے دوسرے دیوتا کا نام۔ رگ وید میں وشنو کا شمار اول درجے کے دیوتاؤں میں نہیں ہوتا۔ وہ شمسی طاقت (Solar Energy) کا مظہر ہیں۔ کائنات ان کے تین قدموں کے نیچے ہے اور ان کے نور کے عبارت بھری ہوئی ہے۔ تین قدموں سے مراد ہے روشنی یعنی آگ، بجلی اور سورج۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد سورج کا طلوع ہونا، نصف النہار پر پہنچنا اور غروب ہونا ہے۔ وشنو کی خصوصیت دنیا کی حفاظت اور رکھوالی ہے۔

براہمنوں کی لکھی ہوئی تحریروں میں، جن میں ویدک رسوم بیان کیے گئے ہیں اور جو "براہمن" کے نام سے مشہور ہیں، وشنو کو نئی صفات سے متصف کر دیا گیا ہے اور ان کا درجہ بہت بلند ہو گیا ہے۔ مہابھارت اور پرانوں میں وہ ہندو تثلیث کے دوسرے دیوتا ہیں اور ستوگن یعنی رحم اور کرم کا مظہر ہیں اور اس لیے دنیا کے رکھشک ہیں۔ یہ وہ روح ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اس لیے ان کو ازلی اور ابدی پانی کے عنصر سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس شکل میں وشنو کا نام نارائن ہے یعنی پانی میں حرکت کرنے والا۔ تصویروں میں انہیں شیش ناگ پر لیٹا ہوا دکھایا جاتا ہے جو ازلی اور ابدی پانی (اصول اول) میں تیر رہا ہے۔ یہ اس وقت کا منظر ہے جب کائنات اپنی زندگی کا ایک چکر پورا کر کے غارت ہو جاتی ہے اور زندگی کا نیا چکر شروع کرنے والی ہوتی ہے۔

وشنو کے پجاری ان کو سب سے بڑا دیوتا مانتے ہیں جن سے تمام اشیا ظاہر ہوئی ہیں۔ مہابھارت اور پرانوں میں وہ پرجاپتی (خالق کائنات) ہیں اور ان کا ظہور تین حالتوں (اوستھاؤں) میں ہوتا ہے۔(۱) برہما خالق کائنات جو ازل اور ابدی پانی پر تیرتے ہوئے محو خواب وشنو کی ناف سے نکلنے والے کنول کے پھول سے پیدا ہوئے ہیں۔ (۲) وشنو خود جو اپنے اوتاروں مثلاً رام اور کرشن کی شکل اختیار کرتے ہیں اور اس طرح دنیا کی حفاظت اور رکھشا کرتے ہیں۔ (۳) شیو زور یا مہیش جو تباہی اور بربادی کی طاقت ہیں۔

وشنو کے اوتاروں کی تعداد صرف دس ہے۔ لیکن بھاگوت پران میں بائیس بیان کی گئی ہے اور کچھ ان گنت اوتاروں کا بھی ذکر آیا ہے۔ سب سے زیادہ مقبول ساتویں اوتار رام اور آٹھویں اوتار کرشن ہیں، اور ان دونوں میں بھی کرشن کو وشنو کا مکمل ترین مظہر سمجھا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مقدس گنگا وشنو کے قدموں (چرنوں) سے نکلی ہے۔ وشنو دنیا کے رکھوالے کی حیثیت سے بہت مقبول دیوتا ہیں اور ان کی پوجا مسرت کے جذبے کے ساتھ کی جاتی ہے۔ ان کے ہزار نام ہیں اور ان ناموں کا جپنا مبارک سمجھا جاتا ہے۔ ان کی سواری (واہن) عقاب ہے۔ ان کا رنگ گہرا نیلا ہے اور چار ہاتھ ہیں۔ ایک میں شنکھ، دوسرے میں چکر (ہتھیار) تیسرے میں گدا (گرز) اور چوتھے میں کنول کا پھول ہے۔ ان کے پاس ایک کمان اور ایک تلوار بھی ہے۔ ان کی بیوی لکشمی (دولت کی دیوی) ہیں جن کے ساتھ وہ کنول کے پھول پر بیٹھے یا کنول کے پتے پر تیرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ (ڈکشنری آف ہندو مائی تھالوجی، انگریزی، جان ڈاوسن)۔

برہما ہندو تثلیث (تری مورتی) کے پہلے دیوتا کا نام جنھیں جگدیشور، اُت پادک (پیدا کرنے والا)، پرجاپتی اور ودھاتا کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

رامائن کے بیان کے مطابق پہلے صرف پانی تھا جس سے زمین کی تخلیق ہوئی۔ اس پانی سے برہما ظاہر ہوئے جنھوں نے سُور کا حیوانی قالب اختیار کر کے زمین کو اوپر اٹھایا اور اپنے بیٹوں، رشیوں اور منیوں کے ساتھ ساری دنیا کی تخلیق کی۔ مہابھارت کے بیان کے مطابق برہما وشنو کی ناف سے پیدا ہوئے جہاں سے ایک کنول کا پھول باہر نکلا۔ (دیکھیے سہس کنول نمبر ۴) اس لیے ان کا نام نابھی جا اور سروجن بھی ہے وہ اپنی برکتوں سے دیوتاؤں اور ان کے دشمنوں دونوں کو نوازتے ہیں۔ شو دھرم میں برہما کا خالق مہادیو یا رُدر (شو) کو مانا جاتا ہے اس لیے برہما شو لنگ کی پوجا کرتے ہوئے مانے جاتے ہیں۔

جب برہما دنیا کی تخلیق کرتے ہیں تو وہ صرف ایک دن زندہ رہتی ہے اور برہما کا ایک دن دو ارب سولہ کروڑ سال کے برابر ہوتا ہے۔ اس طول طویل دن کے خاتمے پر دنیا آگ سے تباہ ہو جاتی ہے لیکن رشی، منی، دیوتا اور عناصر باقی بچ جاتے ہیں۔ پھر برہما دوبارہ دنیا کی تخلیق کرتے ہیں اور تباہی اور تخلیق نو کا یہ عمل برہما کی عمر کے سو سال تک جاری رہتا ہے (چونکہ برہما کا ایک دن دو ارب سولہ کروڑ سال کے برابر ہوتا ہے اس لیے اس کو پہلے تین سو پینسٹھ سے ضرب دے کر پھر حاصل شدہ عدد کو سو سے ضرب دیجیے تو برہما کی عمر کے سو سال کی مدت کا اندازہ ہوگا۔) سو سال کے بعد برہما بھی ختم ہو جاتے ہیں، سارے دیوتا، رشی، منی بھی ختم ہو جاتے ہیں اور کائنات اپنے عناصر کی شکل میں منتشر ہو جاتی ہے۔ (ہندو صنمیات کی لغت، انگریزی جان ڈاؤسن)۔

وقت کا یہ چکر ہندو تصور ہے جو اسلامی تصور وقت سے مختلف ہے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اس سے ملتا جلتا تصور غالب کے یہاں موجود ہے۔ انھوں نے اپنی فارسی تصنیف ''مہر نیم روز'' میں لکھا ہے کہ صفات عین ذات ہیں اور پرتو آفتاب سے جدا نہیں۔ قیامت کے بعد نیا آدم پیدا ہوگا اور ایک آدم کے بعد دوسرا آدم ظہور کرے گا۔ (دیکھیے دیباچہ دیوان غالب مطبوعہ ہندستانی بک ٹرسٹ، بمبئی۔)

مہیش (شو = مہاشک، یعنی دنیا کو تباہ کرنے والا) ہندو تثلیث (تری مورتی) کے تیسرے دیوتا کا نام۔

شو کا نام ویدوں میں نہیں ملتا۔ لیکن اس کا دوسرا نام رودر رگ وید میں اگنی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ویدوں کے زمانے سے ترقی کر کے ایک عرصے میں طاقتور شو کی شکل اختیار کر لی۔ حالاں کہ شو تباہی اور بربادی کے دیوتا ہیں لیکن ان کی طاقتیں اور صفات اتنی زیادہ ہیں۔ زور کی حیثیت سے وہ مہاکال (وقت) ہیں جو انحطاط، تباہی اور موت لاتا ہے۔ لیکن ہندو عقیدے میں تخریب خود تعمیر کا پیش خیمہ ہے اس لیے شو اور شکر کی حیثیت سے یہ مقدس دیوتا تعمیر اور تخلیق نو کی طاقت بن کر ظاہر ہوتے ہیں جن کی بدولت ہر موت کے بعد زندگی، ہر تخریب کے بعد تعمیر کا مسلسل عمل جاری رہتا ہے۔ اس لیے وہ ایشور اور مہادیو ہیں۔ ان کی تجدید حیات کی طاقت کا اظہار لنگ کی علامت سے کیا جاتا ہے اور اس لیے شو کی پوجا یا تو لنگ کی شکل میں کی جاتی ہے یا کبھی کبھی لنگ کے ساتھ یونی کی بھی پرستش ہوتی ہے، جو ان کی شکتی یا نسوانی طاقت کی علامت ہے۔ شو شکتی کے قدیم فلسفے کے اعتبار سے نسوانی طاقت کے بغیر شو یعنی مرد جسم ہے اور جب اس میں شکتی شامل ہوتی ہے تو وہ شو بن کر جاگ اٹھتا ہے۔ (ہندوستانی تہذیب کے مورخوں اور ماہرین کا خیال ہے کہ لنگ پوجا قدیم آریوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں موجود تھی جس پر موہن جوداڑو کے کھنڈروں سے نکلنے والے لنگ کے نمونے شاہد ہیں۔ ہندو مت میں لنگ پوجا پہلی صدی عیسوی کے آس پاس شامل ہوئی۔) مہاکال اور مہادیو کے علاوہ ان کی تیسری شکل یک دھیان میں کھوئے ہوئے مہایوگی کی ہے جو اپنی تپسیا سے بے پناہ طاقت حاصل کر لیتا ہے، معجزے دکھاتا ہے اور عظیم روحانی کائنات سے مل کر ایک ہو جاتا ہے۔ اس کردار میں وہ ایک نگاہ بھی ہے جسے "اگھور" کہتے ہیں اور جس کا لباس عناصر کے سوا کچھ نہیں۔ وہ دھرتی ہیں جن کے بال الجھے ہوئے ہیں اور جسم پر بھبوت ملا ہوا ہے۔ اپنے پہلے کردار یعنی

تخریبی طاقت کے اعتبار سے وہ بھیرو ہیں جو تخریب اور تباہی سے لذت حاصل کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بھوتیشور بھی ہیں اور بھوت پریت پر حکومت کرتے ہیں۔ وہ اپنے سر کے گرد سانپ لپیٹ کر اور گردن میں انسانی کھوپڑیوں کی مالا پہن کر اپنے بھوت پریت کے لشکروں کے ساتھ شمشانوں کی سیر کرتے ہیں اور مستی کے عالم میں وہ تخریبی رقص کرتے ہیں جسے تانڈو کہتے ہیں۔

شو سکون اور مکمل خاموشی (شونیہ) کے بھی دیوتا ہیں اور رقص کے دیوتا (نٹ راج) بھی۔ تامل ناڈو میں نٹ راج کی پرستش ہوتی ہے اور بنارس میں وشیشور کی۔ ان کا مقام شمال میں کیلاش پربت اور جنوب میں چدم برم کا مندر ہے جہاں ان کو ناچتا ہوا دیوتا مانا جاتا ہے۔ شو کی ایجاد ایک سو آٹھ قسم کے رقص ہیں، بعض لطیف اور خوبصورت اور بعض انتہائی حشر انگیز اور خوفناک۔ ان میں تانڈو سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس رقص سے دنیا تباہ ہو جاتی ہے اور وقت کا ایک چکر پورا ہو جاتا ہے۔

شو کے بھی ہزار سے زیادہ نام ہیں جو ان کی مختلف صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔ شو کا رنگ سفید ہے اور ان کے پانچ سر (پنچ آنن) اور چار ہاتھ ہیں۔ تصویروں میں عام طور سے انھیں جیف ہوا دکھایا جاتا ہے، دھیان میں کھوئے ہوئے۔ ماتھے پر تیسری آنکھ ہے جو اتنی تباہ کار ہے کہ اس سے کام دیو بھسم ہو گئے تھے۔ اس تیسری آنکھ کے اوپر پیشانی نئے چاند سے سجی ہوئی ہے، الجھے ہوئے بالوں کی گانٹھ سر پر سینگ کی طرح دکھائی دیتی ہے جس پر دریائے گنگا کی علامت ہے جس کی آسمان سے گرتی ہوئی دھار کو شو نے اپنے سر پر روک لیا تھا۔ گردن میں کھوپڑیوں کا ہار (منڈ مالا) ہے اور گلے میں سانپ لپٹے ہوئے ہیں (ناگ کنڈل)، اور دنیا تباہ کر دینے والے زہر کو پی لینے کی وجہ سے گردن نیلی ہے، (نیل کنٹھ)، ہاتھوں میں ترشول، ڈمرو، کمنڈل اور رسی ہے۔ جسم پر شیر، ہرنا یا ہاتھی کی کھال کا لباس ہے۔ عام طور سے ان کا واہن (سواری) نندی بیل پاس ہی نظر آتا ہے۔ پروفیسر کوسمبی کے بیان کے مطابق ننگ پرا ان کی شہادت پر

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نندی بیل شو کا باطنی نشان (Totem) ہے اور پتھر کی تہذیب کے آخری دور (Neolithic Age) سے تقریباً دو ہزار سال پہلے وحشی قبائل میں نندی بیل کی پرستش کا ثبوت ملتا ہے۔ اس طرح شو کا کردار آریائی اور غیر آریائی قبائل کے اتحاد کی علامت بن جاتا ہے۔ (ماخوذ از ا۔ ڈکشنری آف ہندو مائی تھولوجی، انگریزی، ڈاؤسن، ۲۔ دی وندر ویٹ واز انڈیا، انگریزی، باشم، ۳۔ انٹروڈکشن ٹو دی اسٹڈی آف انڈین ہسٹری۔ انگریزی، دامودر دھرمانند کوسمبی)۔

سرسوتی علم اور فن، شعر اور شاعری کی دیوی۔ ویدوں میں ایک ندی اور ایک دیوی دونوں صورتوں میں ذکر ہے۔ سرسوتی ندی بہت مقدس تھی اور آریوں کے ابتدائی ہندوستانی وطن برہما ورت کی ایک سرحد پر بہتی تھی۔ ندی کی دیوی کی حیثیت سے سرسوتی زرخیزی اور پاکیزگی کی علامت ہے۔ نطق اور بیان (واچ) کی دیوی کی حیثیت سے ویدوں میں ذکر نہیں ملتا لیکن براہمنوں اور مہابھارت میں وہ نطق اور بیان کی دیوی ہے۔ ہندو صنمیات میں سرسوتی برہما کی بیوی ہے اور سنسکرت زبان اور دیوناگری حروف کی خالق مانی جاتی ہے۔ رنگ سفید ہے اور اعضا متناسب، ماتھے پر نیا چاند ہے اور وہ کنول کے پھول پر بیٹھی یا کھڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ (ہندو صنمیات کی لغت، انگریزی، جان ڈاؤسن)۔

اندر آکاش کا دیوتا۔ ویدوں نے اس کا شمار اول درجے کے دیوتاؤں میں کیا ہے لیکن وہ غیر مخلوق نہیں ہیں۔ ماں اور باپ کا ذکر ہے۔ ان کا رنگ سنہرا ہے اور ہاتھ لمبے ہیں۔ لیکن وہ اپنی شکلیں بدل سکتے ہیں اور بے شمار روپ اختیار کر سکتے ہیں۔ ان کا دو گھوڑوں کا رتھ ہری ہے، ہتھیار بجلی ہے جو دہنے ہاتھ میں ہے۔ سوم رس انھیں بہت مرغوب ہے جسے وہ بلا نوش رندوں کی طرح پیتے ہیں اور اس سے مست ہو جانے کے بعد دشمنوں سے جنگ کرنے نکلتے ہیں۔ فضا کے دیوتا کی حیثیت سے وہ موسموں پر حکومت کرتے ہیں اور بارش کا پانی تقسیم کرتے ہیں۔ ویدوں میں اگنی کے

سوا سب سے زیادہ جس دیوتا کی تعریف ہے وہ اندر ہیں۔ وہ بہت سخی اور فیاض دیوتا ہیں جن کا نام بارش، زرخیزی، بجلی اور طوفان سے وابستہ ہے اور وہ قحط اور خشک سالی کے شور کے خلاف مسلسل لڑتے رہتے ہیں۔ داسو اور اشوروں کے ''پتھر کے بنے ہوئے شہروں'' کو تباہ کرنے کا سہرا ان کے سر ہے۔ ان کی براہ راست پرستش نہیں کی جاتی لیکن کچھ تہوار ان کے نام سے مخصوص ہیں۔ برج کی چراگاہوں میں گوالے ان کی پرستش کرتے تھے لیکن کرشن نے ان کے دل جیت لیے اور اندر کی پوجا بند ہوگئی۔ اس پر اندر کو بہت غصہ آیا اور انھوں نے برج باسیوں پر بارش کا طوفان نازل کیا۔ لیکن کرشن نے جو وشنو کے اوتار تھے گووردھن پہاڑ کو اپنی ایک انگلی پر اٹھا لیا اور اسے سات دن تک چھتری کی طرح استعمال کیا۔ آخر اندر کو شکست ہوگئی اور انھوں نے کرشن کے اقتدار کو تسلیم کر لیا۔

(۱۶)

[illegible]

[illegible]

اور چند سور دو چھوٹیں ناپیں پاوے است

[illegible]

کوئی کتب حک بیتباہ آیے نہ کبھوں بائے

[illegible]

[illegible]

⁂

ترجمہ:

[illegible] اور
اس تماشے کو داس کبیر دیکھ رہے ہیں۔

حاشیہ:

عالمِ ناسوت کا بیان ہے۔

چوراسی چھ سو چوراسی لاکھ فرقہ جینیوں اور ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ایک ذی حیات مُکتی یا نجات پانے سے پہلے چوراسی لاکھ بار زندگی کا قالب اختیار کرتا ہے۔ ایک زندگی کو یونی کہتے ہیں۔

(۱۷)

(۱)

گرہ جدر نین جوت برت ہے
سرت راگ نرت تار باجے
سوہتیا گھرت ہے ، رین دن شش مین
کہیں کبیر پیو گگن گاجے

ترجمہ:

[illegible] (بے تعلقی)
[illegible] رات دن [illegible]
[illegible]

(۲)

جیہں اور پنک کی آرتی کون سی
رین دن آرتی وسو گاوے
گھرت نسان تہاں گیت کی جھالرا
گیت کی گیست کا نادر آوے

ترجمہ:

وہاں لمحے بھر کی اور پل بھر کی آرتی کہاں۔ سارا سنسار رات دن آرتی اُتارتا ہے اور گیت گاتا ہے۔ طبل اور نشان بج رہے ہیں، جھلمل جیوتی کی غیبی جھالر جگمگا رہی ہے، غیب کے گھنٹوں کی آواز آرہی ہے۔

(۳)

کہیں کبیر تہاں دین دن آرتی
جگت کے نکھت پر جگت سائیں
کرم اور بھرم سنسار سب کرت ہے
بیو کی پر کھ کوئی پریمی جانے
سُرت اور نِرت دھار من میں پکڑ کر
گنگ اور جمن کے گھاٹ آئے
نیر نرمل تہاں دین دن جھرت ہے
جنم اور مرن تب انت پائی

*

ترجمہ:

کبیر کہتے ہیں کہ وہاں رات اور دن اپنے چراغوں کو گردش دے رہے ہیں۔ جگت کے تخت پر جگت کا مالک بیٹھا ہوا ہے۔ سارا سنسار کرم اور بھرم (کام اور غلطی) میں مبتلا ہے۔ ایسے پریمی کم ہیں جو پریتم کو پہچانتے ہوں۔ اصلی عاشق وہ ہے جو اپنے دل میں پریم (تعلق) اور بیراگ (بے تعلقی) کی لہروں کو اس طرح ملا لیتا ہے جیسے گنگا اور جمنا کے دھارے مل جاتے ہیں۔ اس کے دل میں یہ مقدس پانی ہمیشہ بہتا رہتا ہے تب کہیں جا کر جنم اور مرن، موت اور زندگی کا انت ہوتا ہے۔

(۴)

دیکھ و وجود میں عجب بسرام ہے
ہوئے موجود تو سبھی پاوے
سُرت کی ڈور سُکھ سند کا جھولنا
گھور کی سور تہاں ناد گاوے
بیر ون کنول تہاں دیکھ ات پھولیا
کہیں کبیر من بھنور جھاوے

❊

ترجمہ:

دیکھ وجود میں کیسا آرام ہے۔ اس کا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جو وجود کو محسوس کر سکے۔ پرماتما کی ڈوریاں ہیں اور سکھ کے ساگر کا جھولا ہے جو پینگیں لے رہا ہے۔ اللہ وہاں باجوں کی سریلی آواز بج رہے ہیں، ایک عظیم الشان غم بلند ہو رہا ہے۔ وہاں بغیر پانی کے کنول کھلا ہوا ہے اور کبیر کہتے ہیں کہ من کا بھونرا اس کا رس پی رہا ہے۔

(۵)

جکر گیے بیچ میں کنول ات پھولیا
تاس کی سکھ کوئی سنت جانے
شبد کی گھور جھوں اور تہاں ہوت ہے
اسیم سمندر کی سکھ مانے
کہیں کبیر یوں ڈوب سُکھ سندھ میں
جنم اور مرن کا بھرم بھانے

❊

ترجمہ:

کائنات کے چکر کے دل میں کیسا حسین کنول کھلا ہوا ہے، اس کا لطف کچھ سنت ہی اٹھا سکتے ہیں (جن کی روحیں پاک ہیں)۔ نغمے (شبد = لفظ) کی گھٹائیں چاروں طرف چھائی ہوئی ہیں اور دل ایک بے کراں سمندر کی مسرت میں ڈوبا ہوا ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ اس سکھ ساگر میں اس طرح ڈوب جاؤ کہ زندگی اور موت کا بھرم باقی نہ رہ جائے۔

(۶)

پانچ کی پیاس تہاں دیکھ پوری بھئی
تین کی تاپ تہاں لگے ناہیں
کہے کبیر یہ اگم کا کھیل ہے
گیب کا چاندنا دیکھ ماہیں
جنم مرن جہاں تاری پوت ہے
ہوت آنند تہاں گگن گاجے
اُٹھت جھنکار تہاں ناد ان حد گھرے
ترلوکنہ محل کے پریم باجے

*

ترجمہ:

دیکھو وہاں پانچوں لذتوں (شبد، سپرش، روپ، رس، گندھ) کی پیاس بجھ گئی ہے اور تینوں دکھوں (مادی، روحانی، ذہنی) کا بخار اتر گیا ہے۔ یہ عقل وفہم سے بالاتر (اگم) کا کھیل ہے۔ دیکھو تمھارے وجود میں غیب کی چاندنی ہے۔ وہاں زندگی اور موت کی تالیاں مسلسل بج رہی ہیں، مسرت کی روشنی آسمانوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک ابدی نغمے کی جھنکار سنائی دے رہی ہے اور ترلوک محل (تین دنیاؤں کا ایوان) کے پریم باجے بج رہے ہیں۔

(۷)

چندر تین کوٹ دیپ برت ہے
تور باجے تہاں سنت جھولے
پیار جھکور تہاں نور برست ہے
رس پیوے تہاں بھکت جھولے

*

ترجمہ:

چاند اور سورج کے کروڑوں چراغ جل رہے ہیں۔ نقارے بج رہے ہیں اور عاشق (سنت) پینگ بڑھا رہا ہے۔ پریم کا گیت گونج رہا ہے، نور برس رہا ہے اور پجاری (بھگت) بھگتی کا رس پی کر جھوم رہا ہے۔

(۸)

جسم مرن بیچ دیکھو انتر نہیں
دھوپ اور چھاؤں ہوں ایک آپس
کہیں کبیر یا سمیں گونگا نشیں
وید کتب کی گم ناپیں

*

ترجمہ

زندگی اور موت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ داہنا اور بایاں ہاتھ ایک ہی ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ یہاں محرم راز گونگا ہو جاتا ہے۔ یہ وہ صداقت ہے جو ویدوں اور کتابوں میں نہیں ملتی (صرف محسوس کی جا سکتی ہے)۔

(۹)

اُدھر آسن کیا کیا اگم پیالا پیا
جوگ کی سول جگ جُگتی پائی
پنتھ بن جائے چل سہر بیگم پُرے
دیا جگدیو کی سہج آئی
دھیان دھر دیکھیا، نین بن پیکھیا
اگم اگادہ سب کہت گائی
سہر بیگم پُرا گم کو نالہے
ہوئے بیگم جو گم پاوے
گنا کی گم نا عجب بسرام ہے
سین جو لکھے سوئی سین گاوے

ترجمہ:

میں نے شونیہ کے (خلاؤں میں معلق) آسن پر بیٹھ کر سادھنا کے ناقابل بیان رس کا پیالہ پیا۔ اب میں اسرار کا محرم ہوں اور وحدت کے راز کا سمجھنے والا ہوں۔ راہ کے بغیر چل کر میں اس شہر میں پہنچ گیا ہوں جہاں کوئی غم نہیں ہے۔ (بیگم پورا = بے غم پور) جگدیو کا رحم اور کرم آسانی سے نصیب ہو گیا ہے۔ میں نے دھیان دھر کے دیکھا تو وہ بغیر آنکھوں کے نظر آ گیا جو لامحدود ہے۔ جسے لوگ نارسائی کی منزل کہتے ہیں، یہ مقام غموں سے آزاد ہے۔ یہاں پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے لیکن جس نے غم پایا وہی بے غم ہو گیا۔ یہاں عجب آرام ہے۔ دانش مند وہ ہے جس نے یہ مقام دیکھا ہے۔ دانش مند وہ ہے جس نے اس کا گیت گایا ہے۔

(۱۰)

سکھ مانی پکو سواد کیسے کہے
سواد پاوے سوئی سکھ مانے
کہیں کبیر باسین گونگا تئیں
بوئے گونگا ہوئی سین جانے

ترجمہ:

یہ حرف آخر ہے، مگر اس کا مزہ کیسے بیان کیا جائے۔ جس نے مزہ چکھا ہے وہی اس لذت کو جانتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ اس سے لذت اندوز ہونے کے بعد جاہل دانش مند بن جاتا ہے اور دانش مند خاموش ہو جاتا ہے۔

(۱۱)

جھکیاں اوڈھوت مستاں مانا رہے
گیان ویراگیہ سدھر لیا پورا
سوانس اسوانس کا پریم پیالا پیا
گگن گرجے تہاں بجے تورا

ترجمہ:

اوڈھوت (جوگی) نشے میں چور ہے۔ گیان (علم) اور ویراگیہ (بے تعلقی) کی تکمیل ہو گئی ہے۔ آتی جاتی سانس کا پریم پیالہ اس نے پیا ہے۔ سارا آکاش سنگیت سے بھرا ہوا ہے۔

(۱۲)

بِن کر تانتیا ناد گاتا رہے
جتن جرنا لیا سدا کھیلے
کہے کبیر بران بران سندھ میں ملاوے
برم سُکھ دھام تہاں بران میلے

٭

ترجمہ:

انگلیوں کے مضراب کے بغیر تاروں سے نغمے نکل رہے ہیں۔ عیش اور غم کا کھیل جاری ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ جو کوئی اپنی زندگی کو زندگی کے سمندر میں ملا دیتا ہے اس کی روح مہا آنند میں ڈوب جاتی ہے۔

(۱۳)

آٹھہو پہر متوال لاگی رہے
آٹھہو پہر کی جھاک پیوے
آٹھہو پہر مستان ماتا رہے
برھم کے دیہہ میں بھکت جیوے

٭

ترجمہ:

آٹھوں پہر کا متوالا پن ہے، آٹھوں پہر جام پر جام چل رہے ہیں۔ آٹھوں پہر سرمستی چھائی رہتی ہے، برھم کے جسم میں بھگت زندہ ہے۔

(۱۴)

سانچ ہی کہیے اور سانچ ہی کہیے
کانچ کوں تیاگ کر سانچ لاگا
کہیں کبیر یوں بھگت بڑھنے ہوا
جسم اور مرن کا بھرم بھاگا

*

ترجمہ:

سچ ہی کہتا ہے اور سچ ہی واپس آتا ہے۔ جھوٹی چمک دمک کو چھوڑ کر سچ ہی کا ساتھ دیتا ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ اس طرح بھگت نڈر ہو جاتا ہے تو زندگی اور موت کا بھرم باقی نہیں رہتا۔

(۱۵)

گگن گرجے تہاں سدا پاوس جھرے
بجت جھنکار نت بجت تورا
گگن کے بھون میں گیت کا چاندنا
اُدے اور اسست کا ناؤں ناہیں
دوس اور دین تہاں نیک سہیں پائیے
پریم پرکاس کے سندہ ماہیں

*

ترجمہ:

وہاں گگن گرجتا ہے اور نور کی جھڑی لگی رہتی ہے۔ تاروں میں جھنکار ہوتی ہے اور تارے بجتے ہیں۔ عرش کے محل میں غیب کی چاندنی چھٹکتی ہے۔ طلوع اور غروب کا نام

بھی نہیں ہے۔ عشق کا نور (ظہور) ایک سمندر ہے جس میں دن اور رات کا وجود نہیں۔

(۱۶)

سدا آنند دُگ دنّد وہاں نہیں
پور نانند بھرپور دیکھا
بھرم اور بھراست نہاں نیک نہیں پائیے
کہیں کبیر رس ایک پیکھا

*

ترجمہ:

صرف سرور ہی سرور ہے۔ نہ دکھ ہے نہ کشمکش۔ وہاں میں نے بھرپور آنند دیکھا ہے۔ وہاں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ وہاں صرف وحدت کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔

(۱۷)

کھیل برہمانڈ کا پنڈ میں دیکھیا
جگت کی نھرسنا دور بھاگی
باہرا بھیترا ایک آکاس وت
دھریا میں اُدھر بھرپور لاگی

*

ترجمہ:

میں نے اپنے وجود (جسم) میں کائنات کا ہنگامہ دیکھا ہے اور مجھے دنیاوی غلطیوں سے نجات مل گئی ہے۔ خارجی اور داخلی وجود سے ایک آسمان بن گیا ہے، محدود اور لامحدود

متحد ہو گئے ہیں۔

(۱۸)

دیکھ دیدار مستان میں ہوئے دیوانا
سکل بھرپور ہے نور تیرا
گیان کا تھال اور پریم دیپک اپنے
ادھر آسن کیا اگم ڈیرا
کہیں کبیر تہاں بھرم بھاسے نہیں
جنم اور مرن کا مٹا پھیرا

ترجمہ:

میں دیدار کی شراب سے مست ہو گیا ہوں، تیرا نور بھرپور شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ گیان کی تھال میں پریم کا دیا جل رہا ہے۔ شوبھ کے آسن پر سادھنا کا ڈیرا ہے۔ کبیر کہتے ہیں وہاں غلطی کا وجود نہیں اور زندگی اور موت کی کشمکش ختم ہو چکی ہے۔

حاشیہ:

بند (۱) گرو تا اتیں = سورج۔ (دیکھیے نمبر ۸۹)

بند (۲) نرت اور برت ساخت یعنی بھگتوں کے روحانی ریاض کے دو پہلو ہیں۔ ایک نرت جس کا مطلب ہے دنیا سے بے تعلق ہو جانا اور دوسرا برت جس کا مطلب ہے بھگوان سے لو لگانا۔ اس لیے اس نظم میں اور آئندہ نظموں میں نرت کا ترجمہ پریم اور برت کا ترجمہ بیراگ کیا گیا ہے۔ کبیر نے نرت (پریم) کو راگ اور برت (بیراگ) کو دونوں کے تار سے تشبیہ دی ہے۔ جس طرح تار سے راگ پیدا ہوتا ہے اسی

طرح بیراگ اور دنیا سے بے تعلقی سے پریم پیدا ہوتا ہے۔

بند(۶) اگم غیر متحرک، ساکن، ناقابلِ فہم، ناقابل حصول، جس میں دوسرے کی سمائی نہ ہو سکے، گہرا، اتھاہ، لامحدود، بیکراں۔ آگم کی بگڑی ہوئی شکل میں اس کے معنی ہیں مستقبل یا دوسری دنیا۔

(۱۸)

مدھ اکاس اب جہاں بیٹھے، جوت سد اُجیارا ہو
سب سروپ راگ جہاں پھولے، سائیں کرت بہارا ہو
کوٹن چندر سور جیہب جیہیں، ایک روم اُجیارا ہو
دیہی پر ایک نگر سنت ہے، برست امرت دھارا ہو
کہیں کبیر سنو دھرم داسا، لکھو نرنجن دربارا ہو

*

ترجمہ:

وسط آسمان میں جہاں خود بھگوان براجمان ہیں، چمکتے دمکتے لفظوں کا اجالا ہے (صوتِ سرمدی کا نور پھیلا ہوا ہے)۔ جہاں سفید راگ پھول کی طرح کھل رہا ہے، مالک کے وجود کی بہار ہے۔ اس کے ایک روئیں کی روشنی کے سامنے کروڑوں چاند سورج ماند پڑ جاتے ہیں۔ اس پار ایک نگر بسا ہوا ہے جہاں ہر وقت امرت کی دھار برس رہی ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ اے دھرم داس، آؤ اور میرے مالک کا دربار دیکھو۔

(۱۹)

پرماتم گرو نکٹ وِراجیں
جاگ جاگ من میرے
دھائے کیے پریتم چرنن لاگے
سائیں کھڑا سر تیرے
جگن جگن تو نیہہ سُوت بینا
اجہو نہ جاگ سویرے

*

ترجمہ:

دیکھ پرماتما روپی گرو تیرے پاس ہی ہے۔ اے میرے من اب تو جاگ جا۔ دوڑ کے پریتم کے پیر چھولے۔ دیکھ تیرا سائیں تیرے سر پر کھڑا ہوا ہے۔ تجھے سوتے سوتے جگ بیت گئے۔ کیا آج کی صبح بھی تو نیند سے بیدار نہیں ہوگا؟

(۲۰)

من تو پار اُتر کہاں جیہو

آگے پنتھ نہ کوئی، کوچ مکام نہ بیہو

سہج سہاں سر، ناؤ نہیں کھیوٹ، نہ گن کھینچن ہارا

دھرتی گگن کتب کچھ ناہیں، نہ کچھ وار نہ پارا

سہج سن، سہج سن، سہج ایں ہو، شنو سن سدھ مے بیہو

ملی واں ہوئے پنتھ گھٹ سن، واہیں سورتی ہونیہو

بارہ بار بچار دیکھو من، اب کہوں سب جیہو

کہیں کبیر سب جہاز کتب، ہیوں کے سوں تھیہو

❁

ترجمہ:

اے میرے دل، تو پار اتر کہاں جائے گا؟ تیرے سامنے نہ تو کوئی رہرو ہے نہ راہ، نہ کوچ ہے نہ مقام۔ وہاں نہ تو پانی ہے، نہ کوئی ناؤ، نہ کھیون ہارا۔ ناؤ کے باندھنے کے لیے رسی بھی نہیں ہے اور کوئی اسے کنارے کھینچنے والا بھی نہیں ہے۔ زمین، آسمان، وقت (زمان و مکان) سب ناپید ہیں۔ آر پار کچھ نہیں۔ نہ تن ہے نہ من، نہ کوئی مقام جہاں روح کی پیاس بجھ سکے۔ شونیہ کے سناٹے اور خلا میں کچھ بھی تو نہیں ہے۔ ہمت

سے کام لے اور اپنے گھسٹ میں داخل ہو جا (دیکھیے نظم نمبر ۶)، وہیں کوئی ٹھور ٹھکانا ملے گا۔ خوب سوچ لے اے دل، کہیں اور نہ جانا۔ کبیر کہتے ہیں کہ تخیل اور تصور کو چھوڑ چھاڑ کر اپنے وجود میں محو ہو جا۔

حاشیہ:

یہ بظاہر سیدھی سادی نظم انتہائی پیچیدہ و فلسفیانہ خیالات سے بھری ہوئی ہے جس پر شونیہ واد اور وگیان واد (یوگاچار) کے فلسفے کا عکس پڑ رہا ہے۔ ان کے مطابق ایک داخلی تخلیقی قوت ہے جسے "پری کلپ" کہتے ہیں جو "آلے وگیان" کے ازلی اور ابدی مخزن سے ہر تصویر اور ہر تصور کا جوہر حاصل کر سکتا ہے۔ یہ مخزن بجائے خود خالص خیال ہے، وہ خیال جو اپنے وجود کے لیے کسی شے کا محتاج نہیں (خیال مطلق)، یعنی ایسا خیال جو محض خلا، خاموشی اور مکمل سناٹا (شونیہ) ہے۔

(۲۱)

گھر گھر دیپک ہے، نکھے نہیں، اندھ ہے
نکھیں نکھیں نکھی ہے کئے جم پھند ہے
کہیں نہیں کچھ ہی، نہیں کچھ کرن ہے
جینے جی مر دیے، بہوری نہیں مرن ہے
جو کی پڑے سوگ، نہیں کھر دور ہے
ہنسی ہنسی بجھ رہو، تو چرخہ کھجور ہے
ناسہیں دیجھا دیتا، گھر گھر گھال ہے
مور سجیون پاس، تو پاپن پال ہے
ایسن صاحب کبیر سلونا آپ ہے
نہیں جو گ نہیں جاپ، نہیں نہیں پاپ ہے

❊

ترجمہ:

گھر گھر چراغ جل رہا ہے (ہر فرد کے اندر بھگوان کی جوت ہے) اندھی آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن، کھلنے کی کوشش ہو تو ایک دن آنکھیں کھل جائیں گی اور موت سے پھندے کٹ جائیں گے۔ کہنے، سننے اور کرنے کو کچھ بھی نہیں۔ جو جیتے جی مر گیا

(جس نے آرزو کو ترک کر دیا) وہ دوبارہ نہیں مرے گا۔ (''سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو/ وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے'' میر) جو جوگی بھگوان کو نہ پا کر ہجر کی تنہائی (بیوگ) میں پڑا رہتا ہے وہ کہتا ہے کہ گھر دور ہے۔ حضور (بھگوان) تو پاس ہی موجود ہیں (رگِ جاں سے زیادہ قریب ہیں) اور تو کھجور کے پیڑ پر چڑھ کے تلاش کر رہا ہے۔ برہمن گھر گھر جا کر منتر سکھاتا ہے اور لوگوں کو چوپٹ کرتا ہے۔ آبِ حیات کی دھار (جیون = سنجیوں) تو وجود کے اندر بہہ رہی ہے اور تو پتھر کو پوج رہا ہے۔ کبیر اپنا صاحب تو ایسا سلونا (حسین و جمیل) ہے کہ اس کے سامنے جوگ، جاپ، ہون اور پاپ سب فضول ہیں۔ (اس کو حاصل کرنے کے لیے عبادت، تسبیح، عذاب اور ثواب کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔)

(۲۲)

سادھو، سوست گرو مونہی بھاوے

سب پریم کی بھر بھر پیالا، آپ پیوے موہی پاوے

پردہ دور کرے انکھیں کا، برہمہ درس دکھلاوے

جس درس میں سب لوک درسے، اں حد سد سماوے

اتت سی سب سکھ دکھ دکھلاوے سد میں شرت سماوے

کہیں کبیر کو پھنے نہیں، پرپھنے بد پرسادے

*

ترجمہ:

سادھو! مجھے تو وہی گرو محبوب ہے جو سچائی کے پیالے بھر بھر کر خود بھی پیتا ہے اور مجھے بھی پلاتا ہے۔ وہ آنکھوں کے پردے اٹھاتا ہے اور برہم کا جلوہ دکھا دیتا ہے۔ برہم کے جلوے میں سارے جہانوں کے جلوے نظر آتے ہیں اور لامتناہی اور ابدی نعمت ملتی ہے۔ وہاں رنج اور خوشی ایک ہو جاتے ہیں اور ہر لحظہ عشق سے سرشار ہو جاتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ جس کو راہ دکھانے والا مل جائے اسے کوئی خوف نہیں ہے۔

(۲۳)

تمر سانجھ کا گھرا آوے، جیاوے بریم من بن میں
پچھم دس کی کھڑکی کھولو ڈوبہۂ بریم گگن میں
جیب کنول دل رس پیو رے، لہر لیہہ یا تن میں
سکھ گھٹ سہنائی باجے، سوبھ سدہ محل میں
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو،
امر صاحب لکھ گھٹ میں

*

ترجمہ:

شام کے سائے گہرے ہو رہے ہیں اور پریم تن من پر چھا گیا ہے۔ پچھم کی کھڑکی کھول دو اور پریم گگن میں ڈوب جاؤ۔ دل کے کنول کا رس پیو اور لہروں کو اپنے جسم میں جذب کرو۔ سمندر کی طرح لہریں لیتے ہوئے حسن کے محل میں شنکھ، گھنٹے اور شہنائیاں بج رہی ہیں۔ بھائی سادھو سنو، کبیر کہتے ہیں کہ لافانی مالک (امر صاحب) ہمارے گھٹ (جسم) کے اندر ہے، اسے وہیں دیکھو۔

حاشیہ:

پنڈت ہزاری پرساد دوبے ویدی نے لکھا ہے کہ شام کا اندھیرا سنتوں کی شاعری میں بڑھاپے کی علامت ہوتا ہے لیکن اس نظم میں وصال یار کی علامت ہے۔ سنگھ، گھنٹے اور شہنائیاں وصال کا جشن منانے کے لیے ہیں۔ چوں کہ شام کا اندھیرا پچھم کی طرف سے بڑھتا آتا ہے اس لیے پچھم کی کھڑکی کھول اجیالے کی علامت ہے جس میں پچھم سے مراد انسان کی پشت ہے جہاں ریڑھ کی ہڈی کے درمیان سے وہ روحانی شاہراہ گزرتی ہے جسے سوشمنا مارگ کہتے ہیں۔

(۲۴)

جس سے دہن اپار جگت میں،
سو پریتم مجھے پیارا ہو
جیسے نرنن رہے جل بھیتر،
جل ہی میں کرت پارا ہو
[illegible] جیسے جس [illegible]
جیسے ستی چڑھے اگن پر، پریم [illegible]
آپ جرے اوروں کو جارے، راکھے پریم [illegible]
بھو ساگر اتی ندی اگم ہے، [illegible]
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو، [illegible]

ترجمہ:

مجھے وہ پریتم پیارا ہے جو اس جگت میں مجھے ہم سب [illegible] بنا دے۔ جیسے دل کا پتا پانی میں رہتا ہے، پانی ہی میں اپنی سکیلی چھپاتا ہے لیکن پانی اسے بجھا نہیں سکتا اور پارے کی طرح ڈھلک جاتا ہے (اسی طرح میں سنسار میں رہ کر سنسار کے موہ میں نہیں مبتلا ہوتا)۔ جیسے ستی محبت کے عہد و پیمان توڑتی اور آگ میں کود جاتی

ہے، خود جلتی ہے، اوروں کو جلاتی ہے (غم کو کرتی ہے)، لیکن عشق کی لاج رکھ لیتی ہے (میں سنسار کی آگ میں جلتا ہوں)۔ دیا کا سمندر بہت گہرا اور بے کراں ہے۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ کم ہی لوگ اسے پار کر کے دوسرے ساحل تک پہنچ سکتے ہیں۔

(۲۵)

ہری نے اپنا آپ چھپایا
ہری نے نبھیج کر دِکھرایا
ہری نے مجھے کٹھن بچ گھیری
ہری نے دُبدھا کاٹی میری
ہری نے سکھ دکھ بتلائے
ہری نے سب دُند مٹائے
ایسے ہری پہ تن من واروں
پران ہی تجوں ہری نہیں بسارُوں

❋

ترجمہ:

ہری نے اپنے وجود کو چھپایا اور پھر نہایت نفاست سے ظاہر کیا (وہ کائنات کے حسن کی شکل میں ظاہر ہوا)۔ ہری نے مجھے کٹھنائی میں پھنسا دیا ہے اور پھر ہری نے ہی شک اور شبہے کی زنجیریں کاٹ دی ہیں۔ ہری نے سکھ اور دکھ دونوں دیے ہیں اور ہری ہی نے کشمکش کو مٹایا ہے۔ ایسے ہری پر میں اپنا تن من نثار کر دوں گا۔ جان دے سکتا ہوں لیکن ہری کو بھول نہیں سکتا۔

حاشیہ

مری وشنو کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کبیر نے عام طور سے بھگوان کے معنوں میں لیا ہے۔

(۲۶)

اونکار سیے کوئی سرجے، راگ سروپی انگ
نِراکار برگن ابناسی، کر واپی کو سنگ
نام برنجن، نیس مذھے، ناناروپ دھرنت
ترنگر برگن ابناسی اپار انھاہ انگ
مہا سکھ مگن ہوئی ناچے، ابھے انگ ترنگ
س اور تن تھر نہ رہت ہے، مہا سکھ کے سنگ
سب جیتن سب انند سب ہیں دکھ گھنت
کہاں آدِ کہاں انت آپ سکھ بج دھرنت

❁

ترجمہ:

اوم نے سب کی تخلیق کی ہے جو خود نغمے کی طرح ہے۔ وہ جسم سے بے نیاز ہے (نرآکار) اور صفات سے پاک (نرگن) ہے۔ وہ لاسوت (ابتدائی) ہے۔ نام نرنجن ہے لیکن نظروں میں طرح طرح کے روپ دھار کے سماتا ہے۔ وہ لامحدود ہے، لامتناہی ہے، لازوال ہے۔ وہ مہاسکھ، مہا آنند (انتہائی سرور) کے عالم میں ناچتا ہے تو بے شمار جسم موج در موج پیدا ہو جاتے ہیں۔ (انگ انگ میں ترنگ اٹھتی ہے۔) اس

مہا سکھ اور مہا آنند کے ساتھ مل کر تن اور من اپنے آپ کو سنبھال نہیں پاتے۔ شعور اور احساس، عیش اور غم اس سے سرشار ہیں۔ (ہر انگ میں حس و حرکت ہے، ہر انگ سکھ اور درد کو محسوس کرتا ہے۔) اس کی کوئی ابتدا نہیں ہے، کوئی انتہا نہیں ہے، وہ اپنے انبساط کے اندر سے جھلک رہا ہے۔

(نوٹ: اس نظم میں لفظوں کا جو حسن اور نشہ ہے وہ ترجمے میں نقل کرنا ناممکن ہے۔ پہلے چار مصرعوں کو بار بار پڑھیے تو ان کی لذت خود بخود محسوس ہونے لگے گی۔)

حاشیہ:

اونکار = اوم کار = اوم = بھگوان کا راگ روپی یا شبد روپی انگ، وجود مطلق، خالق کائنات۔

(۲۷)

سست گرو سونی دیا کر دینہا
تاتے ان جنہار میں جینہا
بن پگ چلنا بن پر اڑنا بنا چونچ کا چگنا
بن نین کا دیکھن پیکھن، بن سروں کا سننا
چند نہ سور دوس نہیں رہنی، تہاں سُرت لولائی
بنا اَن امرت رس بھوجن، بن جل ترشا بجھائی
جہاں پرس تہاں پورن سکھ ہے،
یہ سکھ کا سوں کہنا
کہے کبیر بل بل سست گر کی، دھن سنش کا لہنا

*

ترجمہ:

یہ میرے ست گرو (سچے مالک) کی مہربانی ہے کہ میں نے عقل وفہم سے بالاتر کا عرفان حاصل کیا ہے۔ اس عرفان کا کیا کہنا جس میں بغیر پیروں کے چلتے ہیں، بغیر پروں کے اُڑتے ہیں، بغیر چونچ کے چگتے ہیں، بغیر آنکھوں کے دیکھتے ہیں، بغیر کانوں کے سنتے ہیں۔ میرا عشق مجھے وہاں لے آیا ہے جہاں نہ چاند ہے نہ سورج، نہ

دن ہے نہ رات۔ اناج نہیں ہے لیکن امرت رس کا بھوجن مل رہا ہے، پانی نہیں ہے لیکن پیاس بجھ رہی ہے۔ جہاں انبساط ہے وہیں مکمل سکون ہے اور یہ آنند ناقابل بیان ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ ایسے گرو کے قربان جایئے۔ اس کے چیلے (سشیہ = شاگرد) کی قسم مبارک ہے۔

حاشیہ:

ان چنہار = غیر متعارف۔

(۲۸)

برگن آگے سرگن ناچے
باجے سوہنگ تورا
چیلا کے پاؤں گروجی لاگے
یہی اچمبھا پورا

*

ترجمہ:

ذات کے سامنے صفات ناچ رہی ہیں۔ اناالحق کا ساز بج رہا ہے۔ سب سے بڑے اچنبھے کی بات یہ ہے کہ گرو چیلے کے قدم چھو رہا ہے۔

حاشیہ:

باجے سوہنگ تورا اناالحق کا ساز بج رہا ہے۔ (دیکھیے ۱۲) اس کی تفسیر یہ ہے کہ ذات کے سامنے ناچتی ہوئی صفات اناالحق کا ساز بجا رہی ہیں۔ جب گرو چیلے کے پیر چھوتا ہے تو دوئی وحدت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کو "سرز توحید" (ایک پن کا بھید) کہتے ہیں۔ (دیکھیے ۴۷)

(۲۹)

پرشن:

کبیر کب سے بھئے بیراگی
تمری سُرت کہاں کو لاگی

اُتر:

نہ جیرا کی میلا ناہیں، نہیں گرو نہیں چیلا
سکل پسارا جن دن ناہیں، جبھہ دن پُرش اکیلا
گورو کو ہم تب کے ابھی بیراگی
ہمری سُرت برھم سوں لاگی
برھما ایہیں جب نوبی دیسی، سنن نہیں جب شکی
سو شکتی کے جسے ناہیں نیے جوگ پہ سکھ
کاسی میں ہم پرگٹ بھئے ہیں، رامانند جسانے
پاس احد کی ساتھ ہم لائے، ملی کرن کو آئے
سبھے سبھے میلا ہوئے گا، جاگی بھگت اُٹھی
کہیں کبیر، سنو سنو گورو کو جلو گیت کے سنگی

*

ترجمہ:

سوال کبیر تم کب سے بیراگی ہوئے؟ تم کس کے عشق میں مبتلا ہو؟

جواب: جب وچتر کا میلا نہیں لگا تھا، جب وحدت میں کثرت کے جلوے دکھانے والے نے اپنا کھیل نہیں شروع کیا تھا، جب گرو اور چیلے کی تفریق نہیں تھی، جب زمین اور آسمان (سکل = سنسار) کا پھیلاؤ نہیں تھا، جب پرش (ذاتِ مطلق) تنہا تھا، اے گورکھ ناتھ، کبیر تب ہی سے بیراگی ہیں، تب ہی سے ہم برہم کے عشق میں مبتلا ہیں۔ ہم نے یوگ اس وقت سیکھ لیا تھا جب برہما کے سر پر تاج نہیں تھا، (تخلیق کائنات کا حق نہیں پایا تھا)، جب وشنو کے ماتھے پر ٹیکا نہیں تھا (دنیا کو پالنے کا ادھیکار نہیں ملا تھا، جب شو کی شکتی پیدا نہیں ہوئی تھی)۔ ہم کاشی (بنارس) میں ظاہر ہوئے اور رامانند نے ہمیں شعور کی روشنی عطا کی۔ احدیت کی پیاس (لامحدود کو حاصل کرنے کا شوق) اور اس سے ملنے کی تڑپ ہم ساتھ لائے تھے۔ اس سادہ سے ہم سادگی ہی کے ساتھ مل سکیں گے اور بھگتی (محبت) کا طوفان امنڈ آئے گا۔ اے گورکھ ناتھ، سنو، کبیر کہتے ہیں کہ اس کے سنگیت کی آواز کے ساتھ ساتھ بڑھتے چلو۔

حاشیہ:

بیچ چترا: وحدت کا کثرت بن جانا۔

برہما، وشنو، شو (دیکھیے ۱۵)

اس نظم میں یہ جذبہ ہے کہ آتما خود برہما، وشنو اور شو سے پہلے موجود تھی۔ آتمن برہمن میں محو تھی۔ حافظ شیرازی نے اسے اس طرح ادا کیا ہے۔

ماجرائے من و معشوقِ مرا پایاں نیست

ہرچہ آغاز نہ دارد نہ پذیرد انجام

(ترجمہ "میری اور میرے محبوب کی محبت کی کہانی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ جس چیز کی

ابتدا نہیں ہے اس کی انتہا کیسے ہو سکتی ہے۔") یعنی میرا عشق ازلی اور ابدی ہے۔ وہ
ہمیشہ سے ہے اور وجود مطلق ہے اور وجود مطلق کی کوئی ابتدا نہیں ہے۔ اور
رومی نے کہا ہے

ما خدمت خرابات دلدار بودہ ایم ما سالہا مصاحب دلدار بودہ ایم
ما در فضائے عالم اسرار سالہا با طائران قدس در اطوار بودہ ایم
ما رازہا خود ز عالم مستی شنودہ ایم بر کوے یار بے غم اغیار بودہ ایم
آدم نبود در ہمہ آیام بودہ ما مست و خراب نرگس آں یار بودہ ایم
پیش از ظہور نجم و افلاک و ادارات در بحر و نقطہ چو پرکار بودہ ایم
در گلشن وصال بہ چندیں ہزار سال پیش از دو کون طائر طیار بودہ ایم
غیر از یکے نہ بود و نباشد و نیستیم در کثرت چنیں پئے اظہار بودہ ایم

(کلیات شمس تبریزی)

(ترجمہ: میں محبوب کے خرابات کا خادم رہا ہوں، میں برسوں اس کا مصاحب رہ چکا
ہوں۔ میں عالم اسرار کی فضا میں طائران قدس کے ساتھ برسوں اڑ چکا ہوں۔ عالم
مستی سے میں نے راز سنے ہیں یعنی یہ کہ دوست یار میں رقیب کے بغیر تنہا رہا ہوں۔ ابھی آدم
کی تخلیق بھی نہیں ہوئی تھی جب میں اپنے یار کی آنکھوں کا مست و خراب تھا۔ آسمانوں
اور ستاروں کے وجود سے پہلے میں وجود مطلق کے نقطے کے گرد گھوم رہا تھا۔ دونوں
جہان کے وجود سے بھی پہلے میں ہی گلشن وصال میں اڑ رہا تھا۔ ایک کے سوا نہ تو کچھ
تھا، نہ وہ ملتا ہے اور نہ ہے۔ صرف اپنے اظہار کے لیے یہ کثرت کی شکل اختیار کی
ہے۔)

(۳۰)

ب نرور میں ایک پکھیرو، بھوگ سرس وہ ڈولے رے
واکی سدھ لکھے نہیں کوئی، کون بھاؤ سون بولے رے
ڈرم ڈار نہاں اب گھس جھایا، بجھی بسیرا لینی رے
آوے ساجھ، اُڑ جائے بسیرا، سرم نہ کاہو دینی رے
سو پنچھی مونہی کوئی نہ بتاوے،
جو بولے گھٹ مانہی رے
ابرن برن روپ ناہیں ریکھ، بیٹھا پریم کے جھانہی رے
گم ابار نرنتر باسا، آوت جاوت نہ دیسا رے
کہے کبیر، سو بھائی سادھو، یہ کچھ اگم کہانی رے
یا بجھی کے کون ٹھور ہے، بوجھو پنڈت گیانی رے

*

ترجمہ:

اس پیڑ پر ایک چڑیا ہے جو مٹھارس پی کر جھوم رہی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ اس کے گیت کا کیا راز ہے۔ جہاں ڈالیوں کا سایہ سب سے زیادہ گہرا ہے وہیں اس چڑیا کا بسیرا ہے۔ وہ شام کو آتی ہے اور صبح اڑ جاتی ہے اور اپنا

راز کسی پر ظاہر نہیں کرتی۔ کوئی نہیں بتاتا کہ وہ کون سی چڑیا ہے جو میرے وجود (گھٹ ۔جسم) میں بول رہی ہے۔ وہ نہ تو رنگین ہے نہ بے رنگ، اس کی شکل ہے نہ صورت۔ وہ پریم کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی ہے۔ لامحدود اور بے کراں ابدیت اس کا نشیمن ہے۔ اسے آتے جاتے کوئی نہیں دیکھتا۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ یہ بڑی پُراسرار (اگم) کہانی ہے۔ اس پنچھی کا ٹھکانا کہاں ہے، اسے کوئی گیان والا بوجھ سکے تو بوجھے۔

حاشیہ:

پکھیرو یہاں جیو آتما (نفس) کا استعارہ ہے اور تروَر (درخت) جسم کا۔

(۳۱)

نِس دن سالے گھاؤ، نیند آوے نہیں
پیا ملن کی آس، نیہر بھاوے نہیں
کھل گئے گگن کواڑ، مندر اُجیار بھیو
بھیو ہے پُرش سے بھینٹ، تن من وار دیو

*

ترجمہ:

ایک زخم ہے کہ رات دن ٹپک رہا ہے۔ درد سے نیند نہیں آتی۔ محبوب سے ملنے کے لیے دل بے قرار ہے۔ ماں باپ کا گھر اب اچھا نہیں لگتا۔ آسمان کے دروازے کھل گئے ہیں اور (ابدیت کا) مندر روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ محبوب (پُرش = ذاتِ واحد، عینِ ذات) سے ملاقات ہوئی اور میں نے اپنا تن من اس پر وار دیا۔

حاشیہ:

گگن کواڑ: شونیہ کا دروازہ، سادھنا، سمادھی۔

(۳۲)

ناچ رے میرے من مست ہوئے

[illegible] کو راگ بجائے رین دن، [illegible] سے سب کوئی

[illegible] ہوئی

[illegible] ناچے، [illegible] ناچے پسن روئی

[illegible] جگ سے سارا

[illegible] ناچے [illegible] سارا

ترجمہ:

اے میرے دل، آج مست ہو کر ناچ، رات دن پریم کا راگ بج رہا ہے اور ہر شخص اس سے [illegible] ہو رہا ہے۔ راہو، [illegible] اور [illegible] ستارے (موت اور زندگی) سب [illegible] کی [illegible] سے ساتھ ناچ رہے ہیں۔ پہاڑ، سمندر، زمین سب اس ناچ میں مبتلا ہیں۔ اور [illegible] ہنسی [illegible] کرتا ہے اور کبھی رو کر۔ صرف چھاپا تلک لگانے والے [illegible] پر [illegible] رہے ہیں کہ وہ جگ سے الگ تھلگ (اس ناچ سے بے [illegible]) ہیں۔ میرا دل [illegible] انداز سے ناچ رہا ہے اور اس کے ناچ پر خود خالق کائنات (سرجن ہارا) ریجھ گیا ہے۔

حاشیہ:

ساری کائنات اصول اول کے گرد ناچ رہی ہے۔ نغمہ حمد و ثنا کا ہے (دیکھیے نمبر ۸۹)۔

(۳۳)

من مست ہوا تب کیوں بولے
ہیرا پایو، گانٹھ گٹھیایو،
بار بار وا کو کیوں کھولے
ہلکی تھی تب چڑھی ترازو،
پوری بھئی تب کیوں تولے
سُرت کلاری بھئی متواری، سدھا پی گئی ہی بولے
ہنسا پائے مان سرووَر، بال ہنس کیوں ڈولے
تیرا صاحب ہے گھر ماہیں، باہر نینا کیوں کھولے
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو،
صاحب مل گئے تل اولے

٭

ترجمہ:

من مست ہو گیا تو اب بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب ہیرا مل گیا اور اسے گانٹھ میں باندھ لیا تو بار بار کھول کر دیکھنے سے کیا فائدہ۔ ترازو ہلکی تھی تو اس کا پلا اوپر تھا، اب ترازو بھری ہوئی ہے تو تولنا بے کار ہے۔ پریم کی ماری شراب پینے والی ایسی متوالی

ہوئی کہ بغیر ناپے تولے ساری شراب چڑھ گئی۔ جس کو مان سرور تھیل مل گئی ہے تو پھر وہ چھوٹے چھوٹے تالابوں کا چکر کیوں لگائے۔ جب تیرا مالک (صاحب) گھر ہی میں ہے تو باہر آنکھیں کھولنے سے کیا ملے گا۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ میرے صاحب جو تل کی اوٹ میں چھپے ہوئے تھے مجھے مل گئے ہیں۔ (میں عین ذات سے مل گیا ہوں۔)

حاشیہ:

اقبال نے کہا ہے

وہ حرف راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفس جبرئیل دے تو کہوں

(۳۴)

موں ہی موں ہی لاگی، کیسے چھوٹے
جیسے کمل پتر جل باسا
ایسے تم صاحب، ہم داسا
جیسے چکور تکت نِس چندا
ایسے تم صاحب، ہم بندا
موں ہی توں ہی آدانت بن آئی
اب کیسے لگن ڈرائی
کہیں کبیر ہمرا من لاگا
جیسے سُرتا سندھ سمائی

*

ترجمہ:

میرا اور تیرا عشق کیسے ختم ہو سکتا ہے۔ جیسے پانی پر کنول کا پتا تیرتا ہے، ویسے تم صاحب (معبود) ہو اور ہم غلام ہیں۔ جیسے رات کے وقت چکور چاند کو پیار بھری نظروں سے دیکھتا ہے، ویسے تم مالک ہو اور ہم بندے ہیں۔ میرا اور تمہارا عشق ازل سے ابد تک پھیلا ہوا ہے، یہ کیسے ختم ہو سکتا ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ جیسے ندی سمندر میں جا ملتی ہے، ہمارا دل تم سے لگ گیا ہے۔

(۳۵)

بالم آؤ ہمارے گیہہ رے
تم بن دکھیا دیہہ رے
سب کوئی کہے تمھاری ناری، مو کوں لاگت لاج رے
دن سے نہیں دل لگایا، تب لگ کیسا سنیہہ رے
اَن نہ بھاوے نیند نہ آوے، گرہ نہ دھرے نہ دھیر رے
کامن کو ہے بالم پیارا، جیوں پیاسے کو نیر رے
ہے کوئی ایسا پر اُپکاری پیو سوں کہے سنائے رے
اب بے حال کبیر بھیو ہے بن دیکھے جیو جائے رے

*

ترجمہ:

بالم ہمارے گھر آؤ۔ تم بن تن من دکھیا ہیں۔ سب لوگ مجھے تمھاری دلہن کہتے ہیں اور مجھے لاج آتی ہے۔ دل سے دل تو لگایا نہیں ہے، پھر یہ کیسا پیار ہے۔ کھانا پینا بھاتا نہیں، نیند آتی نہیں، دل ہے کہ بے قرار ہے۔ گھر میں، ویرانے میں، کہیں بھی تسکین نہیں ملتی۔ دلہن کو اپنا بالم پیارا ہے جیسے پیاسے کو پانی۔ ہے کوئی ایسا سخی جو پیا تک میرا سندیسہ پہنچا دے اور کہے کہ کبیر بے حال ہو رہا ہے۔ بن دیکھے اس کی جان جا رہی ہے (دیدار کے لیے بے چین ہے)۔

(۳۶)

جاگ پیاری اب کا سووے
رین گئی دن کاہے کو کھووے
جن جاگا تن مانک پایا
تیں بوری سب سوئے گنوایا
ہے تیرے چھُٹر، تو سور کھ ناری
کبھوں نہ پی کی سیج سنواری
تیں بوری بورا پی کینھی
بھر جوبن پی اپن نہ چینھی
جاگ دیکھ، پی سیج نہ تیرے
توہ چھانڑا اٹھ گئے سبھے
کہیں کبیر سوئی دُھن جاگے
شبد بان اُر انتر لاگے

*

ترجمہ:

جاگ پیاری، اب کیا سوتی ہے۔ رات ختم ہوگئی، اب دن کیوں کھو رہی ہے۔ جاگنے

والوں نے ہیرے موتی سمیٹ لیے، تو نے اے پگلی سو کر سب کچھ گنوا دیا۔ تیرے پیا سمجھ دار (چتر) ہیں اور تو مورکھ ناری (بے وقوف عورت) ہے۔ تو نے کبھی اپنے پیا کی سیج نہیں سنواری۔ ارے پگلی، تو نے کیا غلطی کی ہے۔ بھرا جوبن لے کر بھی اپنے پیا کو نہیں پہچان سکی۔ آنکھ کھول کے دیکھ، تیری سیج پر پیا نہیں ہیں۔ وہ تجھے چھوڑ کر سویرے ہی سویرے چلے گئے۔ کبیر کہتے ہیں کہ صرف وہ جاگی رہی ہے جس کا دل پیا کے شبد بان (لفظوں کے تیر) سے زخمی ہے۔

(۳۷)

(۱)

سور پرکاس تہاں رین کہاں پائیے
رین پرکاس نہیں سور بھاسے
گیان پرکاس اگیان کہاں پائیے
ہوئے اگیان تہاں گیان ناسے
کام بلوان تہاں پریم کہاں پائیے
پریم جہاں ہوئے تہاں کام ناہیں
کہے کبیر یہ ست وچار ہے
سمجھ وچار کر دیکھ مانہی

ترجمہ:

جہاں سورج کی روشنی پھیلی ہوئی ہے وہاں رات کہاں ملے گی۔ اور جہاں رات کا اندھیرا ہے وہاں سورج نہیں دکھائی دے گا۔ گیان (علم، عرفان) کی روشنی میں اگیان (جہل) کہاں ملے گا۔ اور جہل کے اندھیرے میں عرفان کا نور نہیں نظر آئے گا۔ جہاں ہوس کا زور ہے وہاں عشق کا پتا نہیں اور جہاں عشق ہے وہاں ہوس کا وجود نہیں۔ کبیر کہتے ہیں کہ سچا وچار یہی ہے۔

(۲)

پکڑ سمسیر سنگرام میں پیسیے
دیہہ پر جَنت کر جُدّہ بھائی
کاٹ سیر بیریاں داب جہاں کا تہاں
آئیے دربار میں، سیس نوائی

❊

ترجمہ:

شمشیر ہاتھ میں لے کر میدان جنگ (سنگرام) میں اترو اور اس وقت تک لڑو جب تک جان میں جان ہے۔ دشمن کا سر کاٹ کر اس کا کام تمام کرو۔ پھر مالک کے دربار میں آ کر اپنا سر جھکا دو۔

(۳)

سُور سنگرام کو دیکھ بھاگے نہیں
دیکھ، بھاگے سوئی سور ناہیں
کام اور کرودھ مد، لوبھ سے جوجھنا
سچا گھمسان تن کھیت مانہیں
بیل اور سانچ، سنتوش ساہی بھئے
نام سمسیر تہاں کھوب باجے
کہے کبیر کوئی جوجھے سورما
کایراں بھیڑ تہاں تُرت بھاجے

❊

ترجمہ:

بہادر جنگ کے میدان کو دیکھ کر بھاگتے نہیں اور بھاگنے والے بہادر نہیں ہوتے۔ جسم و جان کے رن میں کیا تمھساں کی لڑائی ہو رہی ہے۔ ہوس، غصہ، غرور اور لالچ مقابلے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ صبر، قناعت اور صداقت کی بادشاہت میں شمشیر کا نام بلند ہو جاتا ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ جب کوئی سورما لڑائی کے لیے نکلتا ہے تو بزدلوں کی فوج پیٹھ دکھا کر بھاگ جاتی ہے۔

(۴)

سادھ کو کھیل تو بکٹ نیٹرا ستی
ستی اور سور کی چال آگے
سور گھمسان ہے پلک دو چار کا
ستی گھمسان پل ایک لاگے
سادھ سنگرام ہے دین دن جوجھنا
دیہہ پر جنت کا کام بھائی

ترجمہ:

صداقت کے متلاشی کی جدوجہد بڑی کٹھن ہے۔ ستی اور سورما کے مقابلے میں اس کا عہد دو زیادہ دشوار ہے۔ سورما کی لڑائی دو چار گھنٹے چلتی ہے، ستی کی جدوجہد ایک پل میں ختم ہو جاتی ہے لیکن صداقت کا متلاشی دن رات جنگ کرتا ہے۔ اس کی لڑائی زندگی کے آخری لمحے تک جاری رہتی ہے۔

(۳۸)

بھرم کے تالا لگا محل رے، پریم کی کنجی لگاؤ
کپٹ کواڑیا کھول کے رے، بے بدھ پی کو جگاؤ
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو، پھر نہ لگے اس داؤ

*

ترجمہ:
دل کے محل میں وہم وگمان کا قفل لگا ہوا ہے۔ اس میں پریم کی کنجی لگاؤ اور کواڑ کھول کر سوئے ہوئے محبوب کو جگاؤ۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ ایسا موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔

(۳۸)

بھرم کا تالا لگا محل رے، پریم کی کنجی لگاؤ
کپٹ کواڑا کھول کے رے، نہ بدھ پی کو جگاؤ
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو، پھر نہ لگے اس داؤ

*

ترجمہ:

دل کے محل میں وہم وگمان کا قفل لگا ہوا ہے۔ اس میں پریم کی کنجی لگاؤ اور کواڑ کھول کر سوئے ہوئے محبوب کو جگاؤ۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ ایسا موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔

(۳۹)

سادھو یہ تن ٹھاٹھ تنبورے کا

اجپا تار، سرورت کھونٹی، سکست راگ ہجورے کا

ٹوٹے تار، بکھر گئی کھونٹی، ہو گیا ڈھورم ڈھورے کا

کہے کبیر سنو بھائی سادھو، اگم پنتھ کوئی سورے کا

*

ترجمہ:

سادھو یہ تن تنبورے کا ٹھاٹھ ہے۔ جب کھونٹی مروڑی جاتی ہے اور تار کھنچتے ہیں تو حضوری کا نغمہ بلند ہوتا ہے۔ اگر کھونٹی ٹوٹ جائے اور تار بکھر جائیں تو یہ ڈھول کا ساز ڈھول میں مل جائے گا۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ اس میں سے صرف برہما شر باہر نکال سکتے ہیں۔

(۴۰)

اودھو، بھولے کو گھر لاوے
سو جن ہم کو بتاوے
گھر میں جوگ، بھوگ گھر ہی میں،
گھر تج بن نہیں جاوے
گھر میں مُکت، مُکت گھر ہی میں،
جو گُر الکھ لکھاوے
سہج سُنّ میں رہے سمانا، سہج سمادھ لگاوے
اُنمن رہے، برہم کو چینہے، پرم تتو کو دھیاوے
شرت برت سوں ملا کر کیے، ان حد ناد بجاوے
گھر میں بستت، بستت بھی گھر ہے،
گھر ہی بستت ملاوے
کہیں کبیرا سنو ہو سادھو،
جیوں کا تیوں ٹھہراوے

*

ترجمہ:

اودھو، ہم کو وہ پیارا ہے جو بھولے بھٹکے کو گھر واپس لاتا ہے، جو گھر چھوڑ کر جنگل میں پناہ نہیں لیتا کیوں کہ گھر ہی میں وصالِ محبوب ہے اور گھر ہی میں زندگی کا لطف۔ جو اَن دیکھے کو دکھاتا ہے۔ گھر ہی میں پابندیاں اور بندشیں ہیں اور گھر ہی میں نجات اور مکتی۔ جو آسانی سے شونیہ (مکمل خاموشی، برہم) میں سما جائے اور آسانی سے سمادھی لگا لے، جو ہر چیز سے بے نیاز ہو کر برہم کو پہچانے اور اصل حقیقت کو محسوس کرے، جو پریم اور یوگ کو ملا کر صوت سرمدی کا ساز چھیڑے۔ کبیر کہتے ہیں کہ گھر میں سب کچھ ہے۔ حقیقت گھر ہی میں ہے اور گھر ہی میں وہ حقیقت مل سکتی ہے۔

حاشیہ:

تانترک سادھوں نے یوگ اور بھوگ کو ایک ہی سمجھا ہے۔ یوگ کی سادھنا (ریاض) ماورائی ادراک کا وہ خواب ہے جو تجربات دنیا سے حاصل کیے ہوئے عام انسانی شعور کی گردن پر رکھ دیا جاتا ہے، اور بھوگ دنیاوی لذتوں، غموں اور مسرتوں کو پوری طرح برتنے کا نام ہے۔ تانترک اصولوں کے مطابق بھوگ کو یوگ کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے، چناں چہ اس اصول میں حسن پرستی، جنسی اور جسمانی ہم آغوشی کے علاوہ گوشت، مچھلی، بھنے ہوئے اناج اور شراب کا استعمال شامل ہے۔ فارسی اور اردو شاعری میں ترغیب گناہ اور عظمت گناہ کا فلسفہ، جس کی وجہ سے یہ شاعری بے حد رنگین اور دلکش ہو گئی ہے، ان تانترک اصولوں سے قریب ہے۔

بندہ نوازیوں پہ خدائے کریم تھا
کرتا نہ میں گنہ تو گناہ عظیم تھا

(امیر مینائی)

اور عمر خیام نے تو حد کر دی، گناہ کو رحمت کی آرائش قرار دے دیا

آباد خرابات ز مے خوردن ما　　خون دو ہزار توبہ بر گردن ما
گر من نہ کنم گناہ رحمت چہ کند　　آرائش رحمت ز گنہ کردن ما

(یعنی یہ دنیا میری شراب نوشی سے آباد ہے، میری گردن پر دو ہزار توبہ کا خون ہے۔ اگر میں گناہ نہ کروں تو بے چاری رحمت کیا کرے گی۔ میرے گناہوں ہی سے تو اس کی آرائش ہوتی ہے۔) اسی فلسفے کے تحت شراب، جو اسلام میں حرام تھی، صوفیانہ شاعری میں شراب معرفت بن گئی اور ایسے اشعار کہے گئے جیسے

ز مے سجادہ رنگیں کن، گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزل ہا

(حافظ)

(یعنی اگر پیر مغاں کہے تو جانماز کو شراب سے رنگین کر لو یوں کہ روحانی رہنما منزل کی راہ و رسم سے بے خبر نہیں ہوتا۔) کبیر کے یہاں کہیں کہیں تانترک اثرات ملتے ہیں جیسے اس نظم میں یوگ اور بھوگ کے متعلق ان کا نظریہ۔ لیکن یہ سب یہاں صرف گھریلو زندگی اور عام سماجی دستے داریوں تک محدود ہے۔ اس میں جنسی ہم آغوشی اور شراب خوری وغیرہ شامل نہیں ہے۔

(۴۱)

سنتو سہج سمادھ بھلی

سائیں تے ملن بھیو جا دن نیں،

سُرت نہ انت چلی

آکھ نہ موندوں کان نہ روندھوں،

کایا کشٹ نہ دھاروں

کھلے نیں سبی بنس بنس دیکھوں،

سُندر روپ نہاروں

کہوں سو نام سُنوں سو سُمرن،

جو کچھ کروں سو پوجا

گیہ ادیں ایت سب دیکھوں، بھاؤ مٹاؤں دوجا

جہاں جہاں جاؤں، سوئی پرکرما،

جو کچھ کروں سو سیوا

جب سوؤں تب کروں دنڈوت، پوجوں اور نہ دیوا

شبد برنتر سوا راتا، ملن بچن کا نیا گی

نیت سنیت کہیوں نہ بسرے ایسی لاگی

کہیں کبیر یہ اُنمن دبسی، سو پرگٹ کر گائی
سکھ دکھ کے اِک پرے پرم سکھ تبھی میں رہا سمائی

*

ترجمہ:

سنتو، سہج سمادھی ہی بھلی ہے۔ جب سے محبوب مل گیا ہے میں نے کسی اور سے لو نہیں لگائی ہے۔ نہ آنکھ بند کرتا ہوں نہ کان، نہ جسم کو تکلیف پہنچاتا ہوں۔ کھلی آنکھوں سے ہنس ہنس کر اس کے حسن کا جلوہ دیکھتا ہوں۔ جو بولتا ہوں وہ نام ہے، جو سنتا ہوں وہ تسبیح، جو کرتا ہوں وہ عبادت۔ میرے لیے گھر اور گلستان ایک سا ہے، دوئی باقی نہیں ہے۔ میں جہاں بھی جاؤں وہ طواف شوق ہے اور جو کچھ کروں وہی اس کی خدمت ہے۔ میری نیند میرا سجدہ ہے، میں کسی اور دیوتا کی پوجا نہیں کرتا۔ دل مسلسل اس کے نام کا گیت گاتا ہے اور کوئی ناپاک لفظ زبان پر نہیں آتا۔ اٹھتے بیٹھتے اس کی یاد تازہ رہتی ہے اور ساز کی لے ٹوٹنے نہیں پاتی۔ کبیر کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دل کی دیوانگی کو ظاہر کر دیا ہے۔ میں انبساط کی اس منزل میں ہوں جہاں دکھ اور سکھ دونوں بے معنی ہیں۔

حاشیہ:

سہج کے معنی ہیں فطری، بے ساختہ اور بے تکلف، اور کبیر نے انھیں معنوں میں سہج سمادھی کا استعمال کیا ہے۔ (دیکھیے اودھو ۵)

بنگال کے باؤل (باؤل = دیوانہ) بھگتوں میں جو "تمام روایتی بندشوں سے آزاد ہوا کی طرح مارے مارے پھرتے ہیں" (کے ایم سین) اور جنھوں نے اپنی عمارت بدھ مت، تانترک اور وشنومت کے کھنڈروں پر کھڑی کی ہے، سہج سادھنا کا بہت حسین تصور ملتا ہے۔

"میں اس لیے دیوانہ ہو گیا ہوں، میرے بھائی
کہ میں کسی رسم، کسی رواج، کسی ملک کا پابند نہیں ہوں
انسانوں کے پیدا کیے ہوئے تفرقے میرے لیے بے معنی ہیں
میں اپنے دل سے پیدا ہونے والی محبت کے سرور میں ڈوبا ہوا ہوں
محبت میں ہجر اور فراق نہیں، وصال ہی وصال ہے
دل سے دل ملے رہتے ہیں
میں اس خوشی میں ناچتا گاتا رہتا ہوں
میں اس لیے دیوانہ سا ہو گیا ہوں میرے بھائی"

اردو کے شاعر میر تقی میر نے انتہائی سرشاری کے اس عالم کو غزل کے دو مصرعوں میں سمیٹ لیا ہے:

اس کا بحرِ حسن سراسر اوج موج و تلاطم ہے
شوق کی اپنے نگاہ جہاں تک جاوے بس وہ کنار ہے آج

آج پر باول بھگتوں کا اصرار اتنا زیادہ ہے کہ وہ اپنی تحریک کی تاریخ بھی قلم بند کرنا گوارا نہیں کرتے۔ اے کے سین نے اپنی انگریزی کتاب "ہندوازم" میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ جب انھوں نے مشرقی بنگال میں دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے ایک باول سے پوچھا کہ "آپ آنے والی نسلوں کے لیے اپنا تاریخی ریکارڈ کیوں نہیں رکھتے؟" تو اس نے جواب دیا کہ "ہم آج کے قائل ہیں اور اس لیے اپنے پیچھے کوئی نقشِ قدم چھوڑنا ضروری نہیں سمجھتے۔" اس وقت دریا کا پانی ترا ہوا تھا اور کچھ مچھلی اپنی کشتی کو کیچڑ میں کھینچ رہے تھے جس کی وجہ سے کیچڑ میں نشان پڑ گئے تھے۔ باول نے ادھر اشارہ کر کے کہا کہ "کیا بھرے پانی میں تیرتی ہوئی ناؤ کوئی نشان چھوڑتی ہے؟ صرف وہ مچھلی جو اپنی مجبوری کی وجہ سے کیچڑ میں ناؤ چلاتے ہیں نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ تو آج کی بات ہے۔ اصلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ بھگتی کے اس

دھارے پر تیرتے رہیں جو بھکتوں کی اپنی زندگی سے پیدا ہوتا ہے اور پھر ایک دھارے کو دوسرے دھارے سے ملا دیں۔ باؤل باؤل ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ وہ کسی طبقے، کسی ذات سے بھی آئیں ان کا کوئی اور کارنامہ نہیں ہے۔ سب دھارے گنگا میں مل کر گنگا بن جاتے ہیں۔"

جاپانی ژن مت کا ایک واقعہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ ایک محفل میں بہت سے ژن جمع ہوئے۔ مقرر تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا۔ اتنے میں ایک چڑیا آئی اور کھڑکی پر بیٹھ کر گانے لگی۔ مقرر نے اپنی تقریر شروع نہیں کی اور چڑیا کا گیت سنتا رہا۔ جب چڑیا گیت ختم کر کے اڑ گئی تو مقرر نے اعلان کیا کہ محفل ختم ہو گئی اور مجمع برخاست ہو گیا۔

غالب کے الفاظ میں اس کا نچوڑ یہ ہے کہ:

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بے خودی زو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے
یعنی بہ حسب گردش پیمانۂ صفات عارف ہمیشہ مست مے ذات چاہیے

اور سچ کے بے ساختہ پن کو اقبال نے اس طرح ادا کیا

نہ بستم در ایں بستاں سرا دل
ز بند ایں و آں آزادہ رفتم
چو باد صبح گردیدم دمے چند
گلاں را آب و رنگے دادہ رفتم

(ترجمہ: میں نے اس رنگ اور بو سے بھری ہوئی دنیا سے دل نہیں لگایا۔ میں ایسے ویسے بندھنوں سے ہمیشہ آزاد رہا۔ صبح کی ہوا کی طرح میں اس چمن میں آیا اور پھولوں کو رنگ اور حسن دے کر چلا گیا۔)

(۴۲)

تیرتھ میں تو سب پانی ہے،
ہووے نہیں کچھ، انہائے دیکھا
پرتیما سکل تو جڑ ہیں بھائی،
بولیں نہیں بولائے دیکھا
پُران کران سبے بات ہے،
یا گھٹ کا پردہ کھول دیکھا
اُنبھو کی بات کبیر کہیں یہ،
سب ہے جھوٹی پول دیکھا

ترجمہ:

تیرتھ میں تو سب پانی ہی پانی ہے، میں نے نہا کے دیکھ ہے اس سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ساری مورتیاں بے جان ہیں، میں نے آواز دے کے دیکھا ہے کوئی جواب نہیں ملتا۔ پُران اور قرآن سب لفظ ہی لفظ ہیں، میں اپنے وجود کا پردہ اٹھا کر دیکھ چکا ہوں۔ کبیر تو صرف تجربے کی بات کرتے ہیں (انبھو = تجربہ، گیان = عرفان) باقی سب جھوٹی باتیں ہیں۔ میں نے ان کی پول دیکھ لی ہے۔

حاشیہ:

صوفیوں اور سنتوں نے علم اور عقل پر عشق کو ترجیح دی ہے۔ ان کے یہاں باطنی عرفان (انتر گیان) اصل عبادت ہے اور عرفان ظاہری عبادت اور اس کے رسوم و قیود کو بے کار کر دیتا ہے۔ اس کا سماجی پہلو یہ ہے کہ مولوی، پروہت اور ظاہری مذہب نے علم اور عقل پر قبضہ کر رکھا تھا۔ انتر گیان اور باطنی عرفان اس اجارہ داری کو توڑ دیتے ہیں اور خدا اور بھگوان کو عام انسانوں تک پہنچا دیتے ہیں۔

(۴۳)

پانی بیچ مین پیاسی
موسہی سن سن آوے ہانسی
گھر میں وستُ نجر نہیں آوت
بن بن پھرت اُداسی
آتم گیان بنا جگ جھوٹھا
کیا متھرا کیا کاسی

❁

ترجمہ:

پانی میں مچھلی پیاسی ہے۔ یہ سن کر مجھے ہنسی آ جاتی ہے۔ گھر ہی میں رکھی ہوئی چیز نظر نہیں آتی (اور اس کی تلاش میں) جنگل جنگل اداس پھر رہے ہیں۔ اگر آتم گیان (خود شناسی، خود ذاتی روح) نہ ہو تو چاہے متھرا جاؤ چاہے کاشی، یہ دنیا جھوٹی ہی نظر آئے گی۔ (بھگوان تیرتھ استھانوں میں نہیں ہے، انسان کے وجود میں ہے۔)

(۴۴)

گگن منڈھ گیب نسان اُڑے

چندر ہار چندوا جہاں ٹانگے، مکتا مانک مڑھے

جیہا تاش دیکھ من نھر کر، روسس جوت جرے

کہیں کبیر پیے جونی ہی، مانا بھرت سرے

❀

ترجمہ:

آسمان کے مندر پر غیب کا پرچم لہرا رہا ہے جس کو چاند نے چندر ہار اور ستاروں نے جواہرات سے سجا دیا ہے۔ اس عظیم نظارے کو دیکھ کر روح و دل کا سکون حاصل کرو جس میں چاند اور سورج روشن ہیں۔ کبیر کہتے ہیں کہ جس نے یہ شراب پی لی وہ مست ہو گیا۔

حاشیہ:

نظم ۱۷ کے پہلے تین بندوں میں بھی کبیر نے چاند، سورج اور ستاروں کے جلال و جمال کو اس نور مطلق کی نشانی سمجھا ہے جس سے ساری کائنات بھری ہوئی ہے۔ اس سنت شاعر نے بار بار خدا کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ یہ خیال کبیر کا اسلامی ورثہ ہے۔ اللہ نور السموات والارض (قرآن حکیم) یعنی اللہ آسمانوں کا اور زمین کا نور ہے۔

(۴۵)

سادھو، کو ہے کہاں سے آیو

سبھی کے من دھوں کہاں سمت ہے، کو دھوں باج بجایو
پاوٹ سرو ایک کاٹھی میں، کو دھوں ڈھلک جگایوں
ہو گ کہاں سج پی وا کو، کہو دھوں کہاں سمایو
اے اپار پار کچھ نہیں، ست گرو جنھیں لکھایو
کہیں کبیر جیسی سوجھ بوجھ جس، تیسی میں آج سنایو

*

ترجمہ:

سادھو، تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟ وہ ارفع اور اعلیٰ کہاں بستا ہے؟ اور وہ کائنات کو کیسا ناچ نچا رہا ہے؟ آگ لکڑی میں چھپی ہوتی ہے، پھر اسے کون جگا دیتا ہے؟ جب لکڑی جل کر خاک ہو جاتی ہے تو آگ کہاں چلی جاتی ہے؟ جنھوں نے ست گرو کو دیکھ لیا ہے ان کے لیے پار اپار (محدود لامحدود) کچھ بھی نہیں۔ کبیر کہتے ہیں کہ جس کی سوجھ بوجھ جیسی ہوتی ہے اس کو ویسی ہی بات میں نے آج سنائی ہے۔

(۴۶)

سادھو سہجے کیا سو دھو

جیسے بٹ کا بیج ماہی میں پر پھول پھل چھایا
کایا مذھے بیج براجے، بیجا مذھے کایا
اگنی پون پانی پرتھمی سبھ، تا بن ملے نا ہیں
کاجی پنڈت کرو بچارے کو نہ آپا ماہیں
جل بھر کمبھ دھرے بیچ دھرتا، باہر بھیتر سوئی
اُن کو نام کہیں کو نہیں، دوجا دھو کھا ہوئی
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو، ستگرو شبد بچ سارا
آپا مذھیں آپے پائے آپے سرجن ہارا

❀

ترجمہ:

سادھو، جسم کی پاکیزگی بہت آسان ہے۔ جیسے پیڑ کے بیج میں پھول، پتیاں، پھل اور سایہ چھپا ہے ویسے ہی جسم کے اندر بیج ہے اور بیج کے اندر جسم۔ اس کے بغیر آگ، ہوا، پانی، زمین، آسمان، کچھ نہیں مل سکتا۔ قاضی اور پنڈت ذرا غور کریں کہ آپ (وجود) کے اندر کیا نہیں ہے۔ پانی سے بھرا گھڑا پانی میں رکھا ہے۔ اس کے اندر بھی

پانی ہے اور ہاتھ بھی پانی۔ اس کو کوئی نام دینا غلطی ہے۔ اس سے دوئی کا دھوکا ہوتا ہے۔ بھائی سادھو سنو، کبیر کہتے ہیں کہ صرف صداقت ہی اصل روح ہے۔ اپنے وجود کے اندر وہ خود ہی دل رہا ہے، وہ جو خود وجود ہے اور خود خالق ہے۔

حاشیہ:

مشہور قدیم فارسی شاعر ابوسعید ابوالخیر نے ایک رباعی میں کہا ہے

پرسید یکے منزل آن مہر گسل
گفتم کہ دل من است او را منزل
گفتا کہ دلت کجاست گفتم بر او
پرسید کہ او کجاست گفتم در دل

(ترجمہ: کسی نے پوچھا کہ اس مہر گسل کی منزل کہاں ہے۔ میں نے کہا میرے دل میں۔ پوچھا تیرا دل کہاں ہے۔ میں نے کہا اس کے پاس۔ پوچھا وہ کہاں ہے۔ میں نے کہا میرے دل میں۔)

ایک اور فارسی شعر:

خود ورد و خود کورہ و خود گل ورد و خود رند سبوکش
خود بر سر آن کوزہ خریدار برآمد، بشکست و رواں شد

(ترجمہ: وہ خود ہی ورد ہے خود ہی کوزہ بنانے والا اور خود ہی وہ مٹی جس سے کوزہ بنتا ہے اور خود ہی اس کوزے میں شراب پینے والا ہے۔ پھر وہ خود اس کوزے کا خریدار بن کر ظاہر ہوتا ہے اور دوسرے لمحے توڑ کر چل دیتا ہے۔ رومی)

(۴۷)

ترور ایک مُول بن ٹھاڑھا، بن پھولے پھل لاگے
سا کھا پتر کچھو نہیں ناکے، سکل کمل دل گاجے
چڑھ ترور دو پنچھی بولے، ایک گرو ایک چیلا
چیلا رہا سو رس چن کھاوے، گرو نرنتر کھیلا
پنچھی کے کھوج اگم پر گٹ، کہیں کبیر بڑی بھاری
سب ہی مورت بیج امورت، مورت کی بلہاری

❊

ترجمہ:

ایک درخت ہے کہ بغیر جڑ کے کھڑا ہوا ہے اور بغیر پھول کے پھل دے رہا ہے۔ اس میں شاخیں ہیں نہ پتیاں۔ وہ سارے کا سارا کنول ہے۔ اس پر بیٹھے ہوئے دو پنچھی بول رہے ہیں۔ ایک گرو اور ایک چیلا۔ چیلا چن چن کے رسیلے پھل کھا رہا ہے اور گرو خوش ہو کر دیکھ رہا ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ اس کا سمجھنا دشوار ہے کہ پنچھی تلاش کی حدوں سے باہر ہے، پھر بھی صاف دکھائی دے رہا ہے۔ ہر مورت (شکل) کے اندر امورت (بے شکل) ہے۔ ہر مورت پر قربان جایئے۔

حاشیہ:

یہاں درخت سے مراد دنیا ہے لیکن اسے بغیر جڑ کا وجود اس لیے کہا ہے کہ وہ مایا کی تخلیق ہے، محض وہم خیال۔ مگر پھیلے (آتمن، جیو) کے ساتھ گرو (برہمن، وجود مطلق) بھی موجود ہے۔ جیو تو رس چکھنے یعنی دنیا کو برتنے اور بھوگنے میں مصروف ہے اور جگوان یا وجود مطلق تماشا دیکھ رہا ہے یعنی اپنی لیلا دکھا رہا ہے اور خوش ہو رہا ہے۔ اس نظم کی ابتدا میں جو ایک ایک معلوم ہوتے ہیں وہ آخر میں ایک ہو جاتے ہیں۔ سے شکل (گرو = ذات مطلق) ہر شکل (جیو - فرد) کے اندر موجود ہے، اس لیے دنیاوی شکلوں ہی پر قربان ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ شیخ سعدی کے الفاظ میں "عاشقم بر ہمہ عالم کہ عالم از اوست" یعنی میں ساری دنیا پر عاشق ہوں کیوں کہ ساری دنیا اسی سے ہے۔ صوفیوں کی زبان میں اس کو "سر توحید" (ایک پن کا بھید) کہتے ہیں۔ حقیقت کی خارجی شکل انسان ہے اور وہ حقیقت کی داخلی شکل خدا کے ساتھ ایک ہے۔ صوفی اپنی خودی کے فریب سے نکل کر ذات مطلق میں غرق یا فنا ہو جاتا ہے۔ پھر اس کو ہر شکل میں وحدت کی تصویر صاف دیکھنے لگتی ہے۔ مولانا رومی نے اس کو "حقیقت در حقیقت غرقہ" (یعنی حقیقت حقیقت میں ڈوب گئی) کہا ہے۔

(۴۸)

جلت منت اجل کبھی، من ہوا رنگی
تتو میں نہہ تتو درساء سنگ میں سنگی
بندہ بے بربندہ کبھاء توڑ سب تنگی
کہیں کبیرا گم گم کیبا، پریم رنگ رنگی

*

ترجمہ:

میں نے اپنی بے چین روح کا سکون حاصل کرلیا ہے اور اب میرا دل ایسے رنگ میں ڈوب گیا ہے کہ میں نے تو (=ساکار=شکل) میں نہ تو (=نراکار= بے شکل) کو دیکھ لیا ہے اور وصال میں محبوب کو حاصل کرلیا ہے۔ میں علائق کی بندشوں سے آزاد ہو گیا ہوں اور میں نے تنگ حدوں کو توڑ دیا ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ میں نے ناقابل حصول کو حاصل کرلیا ہے اور میرا دل محبت کے رنگوں سے رنگین ہو گیا ہے۔

(۴۹)

جو دیکھے سو تو ہے ناہیں، ہے سو کہا نہ جائی
بن دیکھے پر بھید نہ اوے، کہے نہ کوئی پتیائی
سمجھ ہوئے سو سمجھے جیسے، اجرج ہوئے اندھائی
کوئی دھیاوے نراکار کو، کوئی دھیاوے آکارا
دونوں اس دونوں سے نیارا، جانے جان ہمارا
وہ راگ نہ لکھا نہ جائی، سمجھا گیے نہ کوئی
کہیں کبیر سو بوجھے نہ بوجھے، شبد بھید جی جانا

※

ترجمہ:

جو دیکھا جاتا ہے وہ ہے نہیں اور جو ہے وہ یوں سے باہر ہے۔ بغیر دیکھے یقین نہیں آتا اور جو بیان کیا جائے وہ قابل اعتبار نہیں۔ صرف عارف لفظوں کو پہچان سکتا ہے اور جسے عرفان نہیں وہ حیران ہے۔ کوئی تو نراکار (بے شکل) کا دھیان کرتا ہے اور کوئی آکار (شکل) کا، لیکن صرف جاننے والے (عارف) یہ جانتے ہیں کہ برہم دونوں سے پرے ہے۔ وہ راگ ہے جو آنکھوں سے دیکھا نہیں جا سکتا اور اس کی ماتر نہیں (آواز، زیر و بم) کانوں کو سنائی نہیں دیتیں۔ کبیر کہتے ہیں کہ جس نے پریم اور یہ راگ دونوں کو پا لیا ہے اسے موت سے نجات مل گئی۔

(۵۰)

مُرلی نحت اکھنڈ سدا سے، تہاں پریم جھنکارا ہے
پریم حد تجی جب نہائی، ست لوک کی حد ہی آئی
اٹھت سُگندھ سہا ادھکائی، جا کو وار نہ پارا ہے
کوٹ بھان راگ کو روپا، ہیں ست دھن بھرے اوپا

*

ترجمہ:

ابدیت کا ساز ہمیشہ سے بج رہا ہے اور عشق اس کی جھنکار ہے۔ جب انسان عشق کی تمام حدوں سے باہر آ جاتا ہے تب عالم صداقت (ست لوک) کی حدوں میں داخل ہوتا ہے۔ خوشبو کا پھیلتا ہوا دامن بے کنار ہے۔ اس کا کوئی اور چھور نہیں ہے۔ یہ راگ کروڑوں آفتابوں کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ صداقت کی دیوی کی دھن نرالی ہے۔

(۵۱)

سکھیو! ہم پُوں بھئی دلماسی

[illegible] اب میں گیان گلی انھلاسی

گیان گلی میں کھیلن لاگے، بھیں مٹی پیا کی باسی

واہی میں اگم [illegible] اب ہم سرے کو نہ ڈرانی

کہیں کبیر [illegible] بھاگے، سو پائے اب سی

❁

ترجمہ:

سکھیو، میں اپنے پالنہار سے ملنے کے لیے بے قرار ہوں۔ جوبن چڑھ رہا ہے اور جدائی ستا رہی ہے۔ میں گیان کی گلی میں اٹھلاتی پھر رہی ہوں۔ مجھے گیان کی گلی میں اس کی خوشبو آنے لگی ہے۔ پالنہار کا پتہ مجھے [illegible] ہے اور اس میں ایک ایسا سندیسہ ہے جسے میں [illegible] سکتی، مگر اب مرنے سے ڈر نہیں لگتا۔ پیارے بھائی سنو، کبیر کہتے ہیں کہ مجھے [illegible] پریتم (یعنی شوہر) ملا ہے۔

حاشیہ:

صوفیوں کے نزدیک موت وصال محبوب ہے۔ اس کی زیادہ ترقی یافتہ شکل فطرت

سے ہم آہنگی ہے جس نے اردو کے کلاسیکی شعرا کے یہاں بڑی خوبصورت شکل اختیار کی ہے۔ میر کہتے ہیں:

رنگِ گل و بوئے گل، ہوتے ہیں رواں دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے، تو بھی جو چلا چاہے

پھر نہ کچھ دیکھا بجز یک شعلۂ پُر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

(۵۲)

سائیں بن درد کریجے ہوئے
دن نہیں چین رات نہیں نیدیا، کہے کہوں دکھ ہوئے
آدھی رات بچھلے پہرواں، سائیں بنا ترس رہی سوئے
کہت کبیر سنو بھائی پیارے، سائیں ملے سکھ ہوئے

*

ترجمہ:

سائیں (محبوب) نہیں ہے تو کلیجے میں درد اٹھتا ہے۔ دن کو چین نہیں، رات کو نیند نہیں، آخر میں اپنا دکھ کس سے کہوں۔ آدھی رات ہو یا پچھلا پہر، محبوب کے بغیر ایک نیند کے لیے ترس رہی ہوں۔ سنو پیارے بھائی، کبیر کہتے ہیں کہ محبوب ملے تو چین آئے۔

(۵۳)

کون مُرلی شبد سُن آنند بھیو
جوت بِنے بن باتی
بنا مُول کے کمل پرگٹ بھیو
پھُلوا پھُلت بھانت بھانتی
جیسے چکور چندرما جتوے
جیسے چاترِک سوانتی
تیسے سنت سُرت کے ہو کے
ہو گئے جسم سنگھاتی

❁

ترجمہ:

یہ کیسی مرلی بج رہی ہے جسے سن کر سرشار ہو گیا ہوں۔ بتی نہیں ہے لیکن چراغ جل رہا ہے، جڑ نہیں ہے لیکن کنول کھل رہا ہے، رنگ برنگے پھول ہنس رہے ہیں۔ جیسے چکور چاند کو لگاتار تکتا رہتا ہے اور چاتک (پپیہا) سواتی کی ایک بوند کی امید لگائے رہتا ہے اسی طرح اس کے پریم (سُرت) میں میرا سنتوں سے عمر بھر کا ساتھ ہو گیا ہے۔

(۵۴)

سُنا نہیں ذھن کی کھبر انہد کا باجا
رس مند مندر باجتا، باہر سنے تو کیا ہوا
انت پریم رس جا کہا نہیں، عمی ہوا تو کیا ہوا
کاجی کتابیں کھوجتا، کرتا نصیحت اور کو
محرم نہیں اس حال سے، کاجی ہوا تو کیا ہوا
جوگی دگمبر سبوزا، کپڑا رنگے رنگ لال سے
واقف نہیں اس رنگ سے، کپڑا رنگے سے کیا ہوا
مندر جھرو کہا راؤنی، گل جس میں رہے سدا
کہتے کبیرا سن صحیح، ہر دم میں صاحب رم رب

❊

ترجمہ:

ابدیت کا ساز بج رہا ہے لیکن تجھے اس کی دھن کی خبر نہیں ہے۔ مسرت کا یہ نغمہ خود مندر (وجود = گھٹ) کے اندر گونج رہا ہے۔ اس کو مندر کے باہر آ کر سننے سے کیا فائدہ۔ اگر پریم رس نہیں چکھا ہے (عشق کا جام نہیں پیا ہے) تو اوپری عمل (روزہ، نماز، پوجا پاٹ) سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ قاضی کتابیں ڈھونڈتا پھرتا ہے، اوروں کو نصیحت

کرتا ہے لیکن وہ محرم راز نہیں ہے تو صرف قاضی ہونے سے کیا فائدہ۔ جوگی اپنے کپڑے لال رنگ سے رنگتے ہیں لیکن اگر وہ محبت کے رنگ سے واقف نہیں تو کپڑے رنگنے سے کیا ہوگا۔ مندر میں بیٹھنا، تیرتھوں میں جھانکنا، پھولوں کے باغ میں سیر کرنا بے سود ہے۔ کبیر صحیح کہتے ہیں کہ صاحب (بھگوان، برہم) تو ہر سانس میں رچا اور بسا ہوا ہے۔

(۵۵)

بھگت کا مارگ جھینا رے
اجاہ نہیں جانیہ، جرنن لو لینا رے
سادھن کیے رس دھار میں، رہے سن دن بھیب رے
راگ سن شرت ایسے سمے، جیسے جل میں میا رے
سائیں سبھوں میں دیت سر، کچھ بلم نہ کسا رے
کہیں کبیر مت بھگتی کی، پرگٹ کر دیا رے

*

ترجمہ:

بھگت (جویائے حق) کا راستہ باریک ہے۔ وہاں چاہنا ورنہ چاہنا بے کار ہے۔ صرف مالک کے قدموں پر نثار ہو جانا ہی سب کچھ ہے۔ وہاں بھگت اپنی سادھنا کی رس دھار میں ہر وقت ڈوبا رہتا ہے۔ اس کے راگ میں محبت کی رچی اور بسی ہوئی ہے جیسے مچھلی پانی میں تیرتی ہے۔ وہ سائیں (حق) کی سیوا میں اپنا سر دے دیتا ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ میں نے اس بھگتی کے راز کو ظاہر کر دیا ہے۔

(۵۶)

بھائی، کوئی سب گرو سنت کہاوے
نین الکھ لکھاوے
پران پوجیہ کرپائے نیارا، سہج سمادھ سکھاوے
دُوار نہ رُوندھے پون نہ روکے، نہیں بھوکھنڈ تجاوے
یہ من جائے یہاں لگ جب ہی پرماتم درساوے
کرم کرے سہ کرم رہے جو، ایسی جُگت لکھاوے
سدا ولاس نواس نہیں تن میں، بھوگ میں جوگ جگاوے
دھرتی، پانی، آکاش، پون میں، ادھر سدیا چھاوے
سُن سکھر کے سار سلا پر، آسن اچل جماوے
بھینر رہا سو باہر دیکھے، دوجا درشٹ نہ آوے

*

ترجمہ:

بھائی، ست گرو سنت (اصلی سادھو) وہ ہے جو آنکھوں کو نہ دکھائی دینے والے کا نظارہ کراتا ہے۔ جو ظاہری پوجا پاٹ سے بے نیاز کر کے سہج سمادھی سکھاتا ہے۔ دروازے بند کر کے نہیں بیٹھتا، سانس روکنے کی مشق نہیں کرتا، دنیا کو تج دینے کا سبق نہیں دیتا۔

من جب اس منزل پر پہنچتا ہے تب ہی پرماتما کا درشن ہوتا ہے۔ وہ گرو ایسا راستہ دکھاتا ہے جس میں عمل کرنے کے بعد بھی انسان نتیجے سے بے نیاز رہتا ہے۔ وہاں لذت ہی لذت ہے اور تن کی تکلیف نہیں ہے۔ دنیا کی نعمتوں کا لطف بھی ہے اور بھگوان سے لو لگانے کا مزہ بھی۔ دھرتی ہو یا پانی، آکاش ہو یا ہوا، ہر جگہ معبود کا اصل مقام ہے۔ وہ شونیہ (آسماں، خلا) کی چوٹی پر، حقیقت کی چٹان پر، اپنا آسن جماتا ہے۔ جو اندر ہے وہی باہر ہے، دوسرا کوئی نظارہ نہیں ہے۔

حاشیہ

توحید کی طرح ایمان بالغیب بھی اسلام کی بنیاد ہے۔ اس نظم کا پہلا مصرع اس خیال سے قریب ہے۔ کبیر کی شاعری میں دوسرے مقامات پر غیب کا لفظ بار بار آیا ہے۔

(۵۷)

سادھو شبد سادھنا کیجے

جیے بی شبدنے پرگٹ بھئے سب، سونی شبد گپھ لیجے
شبد گرو شبد سُن سکھ بھئے، شبد سو نرلا سوجھے
سونی شش سونی گرو سہاتم، جبھیں امرگت سوجھے
شبدے وید پُران کہت ہیں، شبدے سب ٹھہراوے
شبدے سُر مُنی سمت کہت ہیں، شبد بھید نہیں پاوے
شبدے سُن سُن بھیش دھرت ہیں، شبدے کہے اُراگی
شبد درش سب شبد کہت ہیں، شبد کہے سراگی
شبدے کابا جگ ابیانی، شبدے کبیر پسارا
کہیں کبیر جہاں شبد بیوت ہے، بھیوں بھید ہے سارا

※

ترجمہ:

سادھو، شبد سادھنا کرو (لفظ پر ریاض کرو) جس شبد سے سب کچھ ظاہر ہوا ہے (تخلیق کائنات ہوئی ہے) اسی شبد کو حاصل کرلو۔ شبد ہی گرو ہے جسے سن کر ہم چیلے بنے ہیں اور اس شبد کے سمجھنے والے بہت کم لوگ ہیں۔ جو دل کی کیفیت (مرم - رازِ دروں)

جانتا ہے وہی چیلا ہے اور وہی گرو۔ وید اور پران بھی شبد ہی کا ذکر کرتے ہیں اور شبد ہی سے یہ دنیا قائم ہے۔ رشی اور منی سب شبد ہی بول رہے ہیں لیکن شبد کا بھید نہیں ملتا۔ شبد ہی سن سن کر آدمی فقیر بنتا ہے اور شبد ہی کہہ کر وہ محبوب سے لو لگاتا ہے۔ چھ فلسفے شبد ہی کا بیان کر رہے ہیں اور بیراگ لینے والے بھی شبد ہی کو دہراتے ہیں۔ شبد ہی سے دنیا کا ظہور ہوا ہے اور یہ کائنات شبد ہی کا پھیلاؤ ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ جہاں شبد ہے، وہیں زندگی اور کائنات کا عجیب و غریب راز مضمر ہے۔

حاشیہ:
دیکھیے ص ۱۰

(۵۸)

پی لے پیالا، ہو متوالا
پیالا نام امی رس کا رے
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو
نکھ سکھ نور رہا وِش کا رے

*

ترجمہ:

پیالہ پی کے متوالا ہو جا، یہ وہ پیالہ ہے جس میں اس کے نام کا امرت چھلک رہا ہے۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ تم نے سر سے پاؤں تک اپنے وجود کو زہر سے کیوں بھر رکھا ہے۔

(۵۹)

کہہ سمجھ سے جیسے باوری، کی کرت بڑائی
[illegible] لگی سے ہونیں گئے، جیوڑو جنڑائی
[illegible] سمجھ سمجھ سمجھ پڑھ سب جیو و بھائی
سار پریم کچھ اور ہے، کھوجا سو پائی

*

ترجمہ:

اپنے خصم کو تو پہچانتی نہیں ہے باؤلی، اپنی بڑائی کیا کر رہی ہے۔ یہ چاہ کی چھوڑو، خالی باتیں بنانے سے محبوب ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس پر مت اتراؤ کہ تم نے لفظوں کا پیغام (شبد سندیس) سن لیا (کتابیں پڑھی ہیں)۔ یہ کچھ اور ہی چیز ہے۔ جو اس کو تلاش کرتا ہے وہی اس کو پاتا ہے۔

(۶۰)

سُکھ سمندر کی سیر کا سواد تب پائی ہے
چاہ کا چوترا بھول جاوے
بیج کے مانہی جیوں بیج وسیار ہوں
چاہ کے مانہی سب روگ آوے

ترجمہ:
سکھ ساگر کی سیر کا مزہ تو تب ملے گا جب آرزو کے چبوترے پر (آرام سے) بیٹھنے کا خیال فراموش ہو جائے گا۔ جیسے بیج کے اندر بیج کا پھیلاؤ (درخت) چھپا ہوا ہے، اسی طرح آرزو کے اندر ساری بیماریوں، ساری تکلیفوں کی جڑ ہے۔

حاشیہ:
میر تقی میر کہتے ہیں:

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

(۶۱)

سُکھ ساگر میں آئے کیے، مت جا رے پیاسا
اج ہوں سمجھ نہ باورے، جم کرت براسا
برسن لگے بھرے سرے اگے، پی لے سواسو سواسا
مرگ ترسنا جل چھاڑ باورے، کرو سُدھا رس آسا
ڈھرو پربلاد شُکدیو بیاس، اور پیا ربداسا
پرتھمی سب سدا متوالا، ایک پریم کی آسا
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو، مٹ گئی بھئے کی باسا

❀

ترجمہ:

ارے، سکھ ساگر میں آ کر پیاسا واپس مت جا۔ اے بے وقوف (باورے = باؤلے = پاگل)، اب بھی ہوش میں آ جا، موت تیرا پیچھا کر رہی ہے۔ تیرے سامنے صاف شفاف پانی لہریں لے رہا ہے۔ ہر سانس کے ساتھ اسے پی جا۔ سراب کو ترک کر دے اور آبِ حیات (سُدھا رس = بھگوان سے پریم) کی پیاس پیدا کر۔ یہ پانی دھرو، پرہلاد، شُکدیو، راجہ داس سب نے پیا ہے۔ تمام سنت سادھو پریم ہی کے متوالے ہیں اور پریم ہی کے پیاسے۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ اب خوف کا شیانہ اُجڑ گیا ہے۔

(۶۲)

سنی کو کون سکھاوتا ہے
سنگ سوامی کے تن جارنا جی
پریم کو کون سکھاوتا ہے
تیاگ سانہی بھوگ کا پاونا جی

*

ترجمہ:

اپنے سوامی کے ساتھ آگ میں جلنا ستی کو کون سکھاتا ہے۔ عشق کو کون سکھاتا ہے کہ ترک ہی میں لذت ہے (ہجر ہی میں وصال ہے)۔

(۶۳)

اے من دھیرج کاہے نہ دھرے
پنکھ پتنگی، جیو، جنت، پشو، سب کی سُدھ کرے
تُو جو ماس میں کھوج رہا ہے ماہر کیوں سمرے
من تو ہنس ہے صاحب کے سنگ کا ہے پنجرے
برہہ جدا اور کو دھارے، کارج اک نہ سرے

❀

ترجمہ:

اے میرے من، دھیرج کیوں نہیں دھرتا (صبر اور قناعت کیوں نہیں کرتا)۔ وہ جو جانوروں، چڑیوں، کیڑوں اور پتنگوں تک کی خبر گیری کرتا ہے، جس نے ماں کے پیٹ میں تیری نگہداشت کی تھی، پیدا ہونے کے بعد تجھے کیوں بھولے گا۔ اے میرے من، تو اپنے صاحب کی مسرت کو چھوڑ کر کہاں بھٹک پھر رہا ہے؟ اپنے محبوب کو چھوڑ کر کسی اور کو چاہتا ہے۔ اس طرح تو ایک بھی کام نہیں بنے گا۔

(۶۴)

سائیں سے لگن کٹھن ہے بھائی

جیسے پپیہا بوند کی، پیاسا پیا رٹ لائی

پیاسے پران تڑپھے دن راتی، اور نیر نا بھائی

جیسے مرگی شبد سنیہی، شبد سنی کو جائی

شبد اوپر پران دان دیے، تنکو ناہیں ڈرائی

جیسے ستی جڑھی سب اوپر، بار کی راہ نہ جائی

پاوک دیکھ ڈرے وہ ناہیں، بھسمت ہوئے سدا مائیں

جھوڑو تن اپنے کی آسا، ترسے وہے کی گائی

کہت کبیر سنو بھائی سادھو، ناہیں تو جنم نسائی

❁

ترجمہ:

بھائی، سائیں سے لگن لگانا بہت دشوار ہے۔ جیسے سواتی کی بوند کا پیاسا پپیہا پیا کی رٹ لگاتا ہے اور اس کی پیاس روح دن رات تڑپتی ہے لیکن دوسرا پانی اسے پسند نہیں آتا۔ جیسے سنگیت کا عاشق ہرن سنگیت سننے چلا جاتا ہے اور سنگیت سنتے سنتے جان دے دیتا ہے لیکن ڈر کر پیچھے نہیں ہٹتا۔ جیسے ستی اپنے شوہر کی ارتھی کے ساتھ چتا کو بیٹھ جاتی

ہے، آگ کو دیکھ کر ڈرتی نہیں، اسی طرح تم بھی اپنے جسم کی فکر چھوڑ کر بے خوف ہو کر اس کے گن گاؤ۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ نہیں تو تمھاری زندگی بے کار ہے۔

(۲۵)

جب میں بھولا رے بھائی
میرے سب گرو جگت لکھائی
کریہ کرم اچار چھاڑا، چھاڑا تیرتھ کا مہاما
سنگری دیا بھینی سیانی، میں ہی اک پورانا
نا میں جانوں سیوا بندگی، نا میں گھنٹ بجائی
نا میں مورت دھری سنگھاسن، نا میں پنچھ جڑائی
نا پری ریجھے جپ تپ کیسیں، نا کاپ کے ہارے
نا پری ریجھے دھوتی، چھاڑے، نا پانچوں کے مارے
دن راکھ دھرم کو پاے، جگ سوں رہے اُداسی
اپنا سا جو سب کو جانے، تا ملے اوناسی
سنہے گُسنید باد کو پاگے، چھاڑے گرو گمانا
ست نام نابی کو مبھے، کہے کبیر سجانا

*

ترجمہ:

میرے بھائی، مجھ سے جب بھول ہوئی تو میرے ست گرو نے میری رہنمائی کی۔ میں

نے ظاہری عبادت کو ترک کر دیا، تیرتھ اشنان بھی چھوڑ دیا۔ ساری دنیا سیانی ہوگئی، ایک میں ہی دیوانہ قرار پایا۔ نہ تو میں بندگی جانتا ہوں، نہ گھنٹہ بجاتا ہوں، نہ میں سنگھ سن پر مورت بناتا ہوں اور نہ اس پر پھول چڑھاتا ہوں۔ جاپ اور تپسیا کرنے سے ہری نہیں رنجھتے اور نہ جسم کو جلانے سے راضی ہوتا ہے۔ کپڑے اتار دینے سے اور پانچوں حواس کو قتل کر دینے سے ہری کی خوشنودی حاصل نہیں ہوتی۔ جس کے دل میں رحم ہے، جو متقی اور پرہیزگار ہے، جو دنیا میں رہ کر دنیا سے اداس (بے نیاز) رہتا ہے اور دنیا کے ہر دی حیات کو اپنی طرح جانتا ہے، اس کو لاثانی (بھگوان) ملتا ہے۔ ست گرو ای کو ملتے ہیں۔ کبیر دانش مند ہیں اور کہتے ہیں کہ ست نام صرف اس کو ملتا ہے جو گایوں کھاتا ہے اور غرور کو ترک کر دیتا ہے۔

(۶۶)

من نا رنگائے رنگائے جوگی کپڑا
آسن مار مندر میں بیٹھے
برہم چھاڑ پوجن لاگے پتھرا
کنوا پھڑائے جٹوا بڑھولے
داڑھی بڑھائے جوگی ہوئے گیلے بکرا
جنگل جائے جوگی ڈھیا رمولے
کام جرائے جوگی ہوئے گیلے بجرا
منھوا منڑائے جوگی کپڑا رنگولے
گیتا بانچ کے ہوئے گیلے لبرا
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو
جم دَروَجوا باندھل جیسے پکڑا

❊

ترجمہ:

جوگی کے من میں تو پریم کا رنگ ہے نہیں، اس نے صرف کپڑے رنگوا لیے ہیں۔ آسن مار کر مندر میں بیٹھ گیا ہے اور برہم کو چھوڑ کر پتھر کی پوجا کر رہا ہے۔ اس نے اپنے کان

چڑ کر کنڈل پہن لیے ہیں، بال لمبے کر لیے ہیں اور داڑھی بڑھا کر بکرا بن گیا ہے۔ جوگی جنگل میں جا کر دھونی رما رہا ہے اور خواہشوں کو مار کر بھبھوا ہو گیا ہے۔ سر منڈا کر جوگی نے کپڑے رنگ لیے ہیں اور گیتا پڑھ کر باتیں بنا رہا ہے۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ اس طرح تو ہاتھ پاؤں باندھ کر موت کے دروازے پر ڈال دیا جائے گا۔

حاشیہ:

''جس نے اپنے آپ کو گناہوں سے پاک نہیں کیا، جس نے اعتدال اور سچائی کو چھوڑ دیا اور گیروے کپڑے پہننے کی خواہش کی وہ گیروے کپڑوں کے قابل نہیں ہے۔''
(دھم پد، میکس مولر کے انگریزی ترجمے سے ترجمہ)

ہندوستان کے قومی جھنڈے کے رنگوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے راشٹرپتی ڈاکٹر رادھا کرشنن نے فرمایا ہے: ''جو گیا یا گیروا رنگ دراصل آگ کا رنگ ہے اور آگ وہ استعارہ ہے جس میں ہر کثافت جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔''

اس لیے گیروا لباس تارک الدنیا جوگیوں کا لباس قرار پایا اور بدھ بھکشوؤں نے بھی پہنا۔ لیکن یہ لباس خود ایک قسم کی مذہبی وردی بن گیا۔ اس لیے صوفیوں اور سنتوں نے تمام مذہبی رہنماؤں کے اس قسم کے لباس کی طرح گیروے کپڑوں کی بھی مخالفت شروع کر دی اور اس کے مقابلے میں من کے رنگ یعنی دل کی صفائی اور پاکیزگی پر زور دیا۔

کبیر کی طرح بنگال کے بائل جھنتوں کا یہ کہنا ہے کہ اگر رنگ دل میں نہ ہو تو باہر لیپا پوتی دے گا۔ پتے پھل کے چھلکے کو رنگ دینے سے کچھ پھل نہیں پک جاتا، وہ تو کچا ہی رہتا ہے۔

فارسی اور اردو شاعری میں شیخ اور ملا کے عمامے اور مذہبی کپڑوں کا خوب مذاق اڑایا گیا ہے۔ کفر میخانے کے لوگ شیخ کا عمامہ اتارے جاتے ہیں

جو پاک رکھتے ہیں تن کا جامہ، رکھے ہیں ناپاک دامن دل
خدا کے نزدیک اے مصلّی، نہیں ہیں زنہار وہ نمازی
(محمد رفیع سودا)

(٦٧)

نا جانے صاحب کیسا ہے
مُلّا ہو کر بانگ جو دیوے
کیا تیرا صاحب بہرا ہے
کیڑی کے پگ نیور باجے
سو بھی صاحب سُنتا ہے
ملا بھیری سنت نگارا
کمی حقا بڑھتا ہے
اس تیرے کُبھیر کٹاری
یوں نہیں صاحب ملتا ہے

❊

ترجمہ۔

نہ جانے یہ کیسا صاحب (خدا) ہے۔ ملا ہو کر جو تو اذان دیتا ہے تو کیا تیرا خدا بہرا ہے؟ وہ تو وہ آواز بھی سنتا ہے جو کیڑوں مکوڑوں کے چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ تو ملا چیختا ہے، تکبر لگاتا ہے اور لمبی لمبی بڑھکیں رکھتا ہے۔ تیرے دل میں تو کفر کی کٹاری رکھی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا اس طرح نہیں ملتا۔

(۶۸)

ہم سوں رہا نہ جائے مُرلیا کی دھن سن کے
بنا بسنت پھول اٹ پھولے پھر سدا بولائے
گگن گرجے، بجلی چمکے، اٹھتی ہے ہلور
بگسنت کنول، میگھ برسائے، جیوت پرنیو کی اور
ناری لاگی تہاں من بھیجے، گیت دھجا پھہرائے
کہیں کبیر آج براں ہمارا، جیوت ہی مرجائے

*

ترجمہ:

میں مُرلی کی دھن سن رہا ہوں اور میرا دل قابو سے باہر ہوا جا رہا ہے۔ بغیر بسنت کے پھول کھل رہے ہیں اور بھونرا، بے تحاشا ہوا جا رہا ہے۔ آسمان گرج رہا ہے، بجلی چمک رہی ہے اور میرے دل کے اندر لہریں اٹھ رہی ہیں۔ کنول کھل رہا ہے، پانی برس رہا ہے اور میرے دل کی دیپ جوتی کی طرف لگی ہوئی ہے۔ میرا من وہاں پہنچ گیا ہے جہاں کائنات کی تالیاں بج رہی ہیں اور غیب کا پرچم لہرا رہا ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ آج تو جیتے جی مرجانے میں مزہ ہے۔

(۶۹)

جو کیو دائے مسجد بست ہے، اور ملک کعبہ کیرا
پورب مورت رام نواسی، پچھم کرے کو پیرا
پورب دسا ہری کو واسہ، پچھم اللہ مکانا
دل میں کھوج دیکھ ہی منوا کیو جو، ایسی کریم رامانا
جیسے مورت مرد اُپاسی، سو سب روپ تمہارا
کبیر پوکارے اللہ رام کی، سو گرو پیر ہمارا

❊

ترجمہ:

اگر خدا صرف مسجد میں بستا ہے تو یہ دنیا کس کی ہے؟ اگر رام صرف تیرتھ استھان کی مورتی میں ٹھہرتا ہے تو پھر اس استھان کے باہر کیا ہو رہا ہے؟ ہری پورب میں بستا ہے اور اللہ کا مقام پچھم میں ہے۔ میں کہتا ہوں اپنے دل میں جھانک کر دیکھو، کریم اور رام دونوں یہیں ملیں گے۔ عورت اور مرد اس کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ وہ سب تمہارے اپنے روپ ہیں۔ کبیر اللہ اور رام دونوں کا پالک ہے، وہی ہمارا گرو ہے وہی ہمارا پیر۔

حاشیہ

دل سے پوچھا یہ میں کہ عشق کی راہ
کس طرف مہربان پڑتی ہے
کہا اُن نے کہ نے یہ ہندوستان
نے سوے اصفہان پڑتی ہے
یہ دوراہا جو کفر و دین کا ہے
دونوں کے درمیان پڑتی ہے

(سودا)

(۷۰)

[illegible] سدا بہ درشت، رہیں [illegible] میں پورا

[illegible] درس برم [illegible]، ہوتی [illegible] سب دورا

[illegible] جب جبھی [illegible] سو ہووے

[illegible] دھری [illegible] ہووے، پریم رنگ اُراوے

راگ سروپ اکھنڈ اچل، سرجیے ہے ہردانی

کہے کبیر [illegible] رسو، گیت گیت سب سکھ دانی

ترجمہ:

جس کی طبیعت میں انکسار ہے، دل میں صبر ہے، جو صاحب نگاہ ہے اور رہن سہن میں پورا ہے، خواص (ذات پات) کا بیدار کر چکا ہے، وہ خوف اور ہراس سے بے نیاز ہے۔ اس کے دل میں معرفت ذات پات کا تصور اس طرح رہتا ہے جیسے دل میں صندل کی خوشبو کی ہو۔ اسے کوئی دوسری داستان پسند نہیں آتی۔ اٹھتے بیٹھتے وہ اس کا گیت گاتا ہے اور چاروں طرف پریم رنگ اڑاتا رہتا ہے۔ وہ راگ کی طرح مسلسل اور پرسکون ہے، نڈر ہے اور بے پروا ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ اس کا چرن چھوؤ جو ہر وجود کو سکھ اور پریم سے بھر دیتا ہے۔

(۷۱)

سادھ سنگت پیتم اہاں چل جائیے
بھاؤ بھگت اُپدیس سہاں نے پائیے
سنگت ہی جر جاونہ چرچا نام کی
دولہا بنا برات کہو کس کام کی
دبدھا کو کر دور پیتم کو دھیائیے
اَن دیو کی سیو نہ چت لگائیے
اَن دیو کی سیو بھلی نہہ جیو کو
کہے کبیر وچار نہ پاوے پیو کو

❁

ترجمہ:

نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو، انھیں کے ساتھ پریتم تک رسائی ہوگی۔ فکر اور ذکر اور ہدایت وہیں سے ملے گی۔ وہ محفل جل کر راکھ ہو جائے جہاں اس کے نام کا چرچا نہیں۔ اگر خود دولہا نہ ہو تو برات کس کام کی۔ شک اور شبہے کو دل سے دور کر کے صرف پریتم سے لو لگاؤ۔ کسی اور دیوتا کی سیوا کا خیال بھی نہ کرو کیوں کہ کسی اور دیوتا کی سیوا میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ کبیر سوچ بچار کے بعد یہ کہتے ہیں کہ اس طرح پریتم نہیں مل سکتا۔

(۷۴)

توہار ہرا بارتل ہا کیچڑے میں
کوئی ڈھونڈھے پورب کوئی ڈھونڈھے پچھم
کوئی ڈھونڈے پانی پتھرے میں
داس کبیر یہ ہیرا کو پرکھیں
باندھ لیلے جیرا کے انچرے میں

*

ترجمہ:

تیرا ہیرا کیچڑ میں گر کر کھو گیا ہے۔ کوئی اسے پورب میں تلاش کر رہا ہے اور کوئی پچھم میں، اور کوئی پانی اور پتھر میں۔ لیکن داس کبیر اس ہیرے کی قدر جانتے ہیں اور انھوں نے اسے اپنے دل کی گانٹھ میں باندھ لیا ہے۔

(۷۳)

ابو دن گونے کے ہو من ہوت پلاس
ڈولیا اٹھے سجا سوال ہو، جہاں کوئی نہ ہمار
بتیاں نوری لاگوں کہروا ہو، ڈولی دھر چہیں بار
مل سبھی سکھیا سہیلر ہو، سبھوں کے پرنام
داس کبیر گاویں ہرگن ہو، سادھو کرنے بچار
نرم گرم سودا کرے ہو، اگے ہاٹ نہ بازار

*

ترجمہ:

گونے (دلہن کی رخصت) کا دن آ گیا اور دل خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ وہ میری ڈولی جنگل میں اٹھا رہے ہیں جہاں میرا کوئی نہیں ہے۔ اے کہار، میں تیرے پاؤں پکڑتی ہوں، پل بھر کے لیے ڈولی نیچے رکھ دے، میں اپنی سکھیوں، سہیلیوں اور گھر والوں سے رخصت تو ہو لوں۔ داس کبیر ہر صفت سے بے نیاز ہو کر گا رہے ہیں کہ اے سادھو، نرم گرم جو بھی سودا کرنا ہو جلدی سے کر لو کیوں کہ آگے کوئی بات کوئی بازار نہیں ہے۔

(۷۴)

ارے دل

پریم نگر کا انت نہ پایا، جیوں آیا تیوں جاوے گا

سن میرے ساجن سن میرے میتا،

یا جیون میں کیا کیا بیتا

سر پاپن کو بوجھ بڑا، آگے کون چھڑاوے گا

بولی ہار میرا میتا کھڑیا،

اس ملنے کا دھیان نہ دھریا

پوتی ناؤ ابر ہو سنتو، کہیں گوت کیاوے گا

داس کبیر کہیں سمجھائی،

انت کال تیرا کون سہائی

چلا اکیلا سنگ نہ کوئی، کب اپنا ہووے گا

❁

ترجمہ:

ارے دل، آخر تجھے پریم نگر کا انت نہ ملا (عشق کے راز سمجھ میں نہیں آئے)۔ تو جیسے آیا ہے ویسے ہی جائے گا۔ میرے ساجن، سن میرے دوست، اس زندگی میں کیا کیا

نہیں بیت چکی ہے۔ تو نے اپنے سر پر پتھروں کا بوجھ اٹھا رکھا ہے، اس بوجھ کو کون ہلکا کرے گا؟ دوست تو دوسرے کنارے پر کھڑا ہے۔ تو نے اس سے ملنے کی کوئی ترکیب نہیں نکالی۔ تو ٹوٹی ہوئی ناؤ پر بیٹھا ہے، اے غافل، تو ضرور غوطہ کھائے گا۔ داس کبیر سمجھا کر کہتے ہیں کہ آخری وقت میں تیرا کوئی سہارا نہیں ہے۔ تو اکیلا جا رہا ہے، کوئی سچا ساتھی نہیں ہے۔ تو نے اب تک جو کیا ہے وہی کا پھل تجھے ملے گا۔

(۷۵)

بید کہے سرگن کے آگے نرگن کا بسرام
سرگن نرگن ہو سوبھاگی، دیکھو سب ہی ٹھام
سکھ دکھ وہاں کچھو نہیں ویاپے، درسن آپو ہام
نور اوڑھن نورے ڈاسن، نورے کا سرپان
کہے کبیر سنو بھائی سادھو، سب کرو نور سمان

❊

ترجمہ:

ویدوں کا کہنا ہے کہ سرگن سے آگے نرگن پھیلا ہوا ہے۔ (صفات کی آڑ میں بے صفات چھپا ہے۔) اے سادھو، سرگن اور نرگن سے جھمیلوں میں تجھے کیا ملے گا، دیکھ ہر مقام تیرا مقام ہے۔ وہاں سکھ اور دکھ کا دخل نہیں ہے، آنکھوں پر چاروں طرف درشن ہی درشن ہے (دیدار ہی دیدار ہے)۔ نور کی چادر ہے، نور کی مسند ہے، نور کا تکیہ ہے۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ سب کو سراپا نور ہے۔

حاشیہ:
دیکھیے نظم ۴۴

(۷۶)

(۱)

تو صورت میں سہارا، وہ انڈ میں سمارا ہے
تو پردے سوچ بچار یہ دیش ہمارا ہے
ست گرو درس ہوئے جب بھائی
وہ دیں تم کو پریم جتائی
سُرت بُرت کے بھید بتائی
تب دیکھیے انڈ کے پارا ہے
سکل جگت میں ست کی نگری
چت بھلاوے بانکی ڈگری
سو پہنچے جالے بن پگ دی
ایسا کھیل اپارا ہے

*

ترجمہ:

تو اس کی صورت اپنی آنکھوں میں بسا لے اور دیکھ کہ یہ دنیا اس کے وجود سے بھری ہوئی ہے۔ دل میں سوچ تو معلوم ہوگا کہ یہ سارا دیش تیرا اپنا ہے۔ جس دن ست گرو کے درشن ہوں گے اس دن عشق جاگ اٹھے گا، تعلق اور بے تعلقی کے سارے راز کھل

جائیں گے اور تب محسوس ہوگا کہ وہ (اس دنیا میں ہوتے ہوئے بھی) اس دنیا سے ماورا ہے۔ یہ تلقین سب کی نگری ہے، اس کی نیچی باتیں پگڈنڈیاں دلکش ہیں۔ یہ کیسا عجیب کھیل ہے کہ ان راہوں پر قدم رکھے بغیر ہی چلنے والے منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔

(۲)

لیلا شکھ اننت وہاں کی
جہاں راس وِلاس اپارا ہے
گھن نجن چھوٹے یہ باتی
پھر نہیں پانا ستانا ہے
بد نربان ہے اننت اپارا
سُرت سورت لوک ہمارا
ست پُرش نو تن تن دھارا
صاحب سکل روپ سارا ہے
باگ بگیچے کھیلی پھلواری
امرت لہریں بو رہیں جاری
ہنسا کیل کرت ننھ پیاری
جہاں ان حد گھورے اپارا ہے
نامدہ ادھر سنہاسن گاجے
پرش سہانہاں ادھک براجے
کوٹن سور روم اک لاجے
ایسا پرش دیدارا ہے
پتھ بنا ست راگ اُچاریں
جو بیدھت ہے منجھارا ہے

جنم جنم کا امرت دھارا
جہاں ادھر امرت پُھہارا ہے
ست سے ست سُنّ کہلائی
ست بھنڈار پابی کے ماتھی
نہتت رچنا تاو رچائی
جو سبھن تیں نیارا ہے
احد لوک وہاں ہے بھائی
پُرش انامی اکہا کہائی
جو پہنچے جانیں گے واہی
کہن سنن تے نیارا ہے
رُوپ سروپ کچھو وہاں ناہیں
ٹھور ٹھانوں کچھو دیسے ناہیں
اجر تول کچھ درشٹ نہ آئی
کیسے کہوں سُمارا ہے
جا پر کرپا کرہے سائیں
ان بد مارگ گاوے تابی
اُدبھو پرلے باوت ناہیں
جب پاوے دیدارا ہے
کہیں کبیر مکھ کہا نہ جائی
نا کاگد پر انک چڑھائی
مانوں گونگے سم گڑ کھائی
کیسے بچن اُچارا ہے

❊

(۷۷)

چل ہنسا وا دیس جہاں پیا بسے جت چور
سُرت سوہاگن ہے بسہارن بھرے ٹھاڑہ بن ڈور
وہ دیسواں بادر نا اُمڑے رم جھم برسے مینھہ
جو بارے میں بیٹھ رہو نا، جا بھیجھہ بردیھہ
وہ دیسوا میں ست پورنما کب نیوں نہ ہوئے اندھیر
ایک سُرج کے کون بتاوے، کوٹن سُرج اُجیر

❋

ترجمہ:

اے ہنس، اُس دیس چل جہاں دل چرا لینے والے پیا کی نگری ہے، جہاں پر پریم کی سہاگن کھڑی ہوئی بغیر ڈور کے پانی بھر رہی ہے۔ اس دیس میں بادل گھر کے نہیں آتے ہیں لیکن مینھہ رم جھم برستا ہے۔ جو بارے میں مت بیٹھ، باہر نکل اور اپنے بغیر جسم کے وجود (نردیہہ) کو بھیگ جانے دے۔ اس دیس میں چاندنی ہمیشہ کھلی رہتی ہے اور اندھیرا کبھی نہیں ہوتا۔ ایک سورج کی بات کون کرتا ہے، وہاں تو کروڑوں سورج چمک رہے ہیں۔ (ہنس = روح = دل)۔

(۷۸)

کہیں کبیر سو ہو سادھو امرت بچن ہمار
جو بھی چاہو اُبھو، پرکھو کرو بچار
جے کرب ہی اوپجے تاسوں پرگٹو بیج
ابھی ندھی ووبک ہی، سہج بسابی سیج
بھی ہی نے سب سب جیے، یہی چلیو اُپدیس
سنجنے گیہ نرہنے رہو، شی پرم ست سندیس
کبھی گاؤ کبھی دھیاؤ ہو، چھوڑو سکل دھمار
یا پرتے سب کو سمے، کیوں سیوو شی اجار
دور ہی کرب تیاب کیے، کری دور کی آس
جو کرب دوے نیے، تو کو جگ سرجے پاس
جو جانو یہاں ہے نہیں، تو تم دھاوو دور
دور سے دور پھرم پھرم نشپھل مرو بسور
ڈولیو درس دور کیے، نیر سدا سکھ پاس
کہیں کبیر موہہ وہ پیا، مت دکھ پاوے داس
آپ این ہو جینہو، نکھ سکھ سہت کبیر

آنند منگل گاوہو ہوہی این بونھیر

❀

ترجمہ:

سنو سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ ہمارا بچن امرت ہے (ہماری بات لافانی ہے)۔ اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو ہمارے بچن کو پرکھو اور اس پر غور کرو۔ تم اپنے خالق سے بیگانے ہو گئے ہو۔ تم نے اپنی عقل گم کر دی ہے اور موت کو خرید لیا ہے۔ تمام فلسفے یہیں سے چلے ہیں، تمام تعلیمات یہیں سے نکلی ہیں۔ یقین پیدا کرو اور بے خوف ہو جاؤ اور عظیم صداقت کا پیام مجھ سے سنو۔ تم کس کے گیت گاتے ہو، کس کا دھیان کرتے ہو؟ ارے، شکلوں کے اس فریب سے باہر نکلو۔ وہ تو سب کے دل میں بستا ہے، پھر اجاڑ ویرانوں میں مارے مارے پھرنے سے کیا فائدہ۔ اگر تم نے گرو کو دور رکھا ہے تو ظاہر ہے کہ تم دوری اور فاصلے کی پوجا کر رہے ہو۔ اگر مالک واقعی دور ہے تو پھر اس آس پاس کی دنیا کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اگر تم نے اس کو دور سمجھ لیا ہے، تو پھر تم دور سے دور اس کی تلاش میں جاؤ گے لیکن وہ روتے بسورنے اور آنسو بہانے سے بھی نہیں مل سکتا۔ جب وہ دور ہے تو پھر اس کا درشن بھی دور ہے، جب وہ پاس ہے تو صرف مسرت اور سعادت ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ اے بندے (داس)، کیوں دکھ اٹھاتا ہے۔ وہ تو تیرے وجود میں جاری اور ساری ہے۔ اپنے آپ کو پہچان لو، کبیر، وہ سر سے پاؤں تک تم میں بسا ہوا ہے۔ خوشی کے گیت (آنند منگل) گاؤ اور دل کا سکون باقی رکھو۔

(۷۹)

نہیں دھرمی نہیں ادھرمی، نہیں جتی نہ کامی ہو
نہیں کہنا نہیں سننا، نہیں سپوت سوامی ہو
نہیں سدھا نہیں شکشا، نہیں برت نہ رنگی ہو
نہ کہو سے سرا سوا، نہ کہو کے سنگی ہو
نہ بہ برک بوٹ کو جانے نہ بہ نرگ سدھارے ہو
سب ہی کرم ہمارا کہنا، بہ کرمی سن سارے ہو
نہ سب کو کہنی ہرے جیسے، سوا ہو سبھے ہو
سب کسر کہو کو چاہے، سب کہو کو منے ہو

ترجمہ:

نہ میں دھرمی ہوں اور نہ ادھرمی، نہ میں قانون کا بندہ (برہم چاری) ہوں اور نہ خواہشوں کا غلام۔ نہ میں بولتا ہوں نہ سنتا ہوں۔ نہ میں عابد ہوں نہ معبود۔ نہ میں جبر سے قبضے ہوں نہ اختیار سے۔ نہ میں کسی سے تعلق ہے نہ میں بے تعلق ہوں۔ نہ میں کسی سے دور ہوں نہ کسی سے قریب۔ نہ ہم جہنم میں جاتے ہیں نہ جنت کا راستہ لیتے ہیں۔ سب کام ہم نے کیے ہیں لیکن ہم کام سے بے نیاز ہیں۔ اس فلسفے (مت) کے سمجھنے والے کم ہیں لیکن جس نے سمجھ لیا وہ مطمئن ہو گیا۔ پھر نہ تو کسی مت کا بانی ہے اور نہ کسی مت کا ماننے والا۔

(۸۰)

ست نام ہے سب تیں نیارا
نرگن سرگن شبد پسارا
نرگن بیج سرگن پھل پھولا
ساکھا گیان نام ہے مولا
مول گہے تیں سب سکھ پاوے
ڈال پات میں مول گنواوے
سائیں ملائی سکھ دلائی
نرگن سرگن بھید مٹائی

ترجمہ:

ست نام سب سے نیارا ہے (ایسا نام کوئی اور نہیں)۔ نرگن (بے صفات) اور سرگن (صاحب صفات) صرف الفاظ ہیں۔ نرگن بیج ہے اور سرگن پھل اور پھول۔ گیان اس کی شاخ ہے اور نام اس کی جڑ۔ جو جڑ تک پہنچ گیا اس نے مسرت حاصل کر لی۔ جو ڈال پات میں الجھ گیا وہ جڑ تک کبھی نہیں پہنچا۔ مالک (سائیں) سے ملاقات مسرت کا حصول ہے اور اس سے نرگن اور سرگن کے بھید بھاؤ مٹ جاتے ہیں۔

حاشیہ:

درخت، شاخ اور جڑ کا استعارہ عبدالرحمن جامی کے یہاں بھی ہے

دل مشیں در این ویرانہ چوں بوم — سوے مرغان قدسی آشیاں بر
بود گیتی درختے سر بسر شاخ — ولے جملہ سوے یک اصل رہبر
زہ شاخے سوے آں اصل رو جوی — چوں آں را یافتی از شاخ بگذر
نہ باشد شیوہ مرغان ریک — نشستن ہر زماں بر شاخ دیگر

(ترجمہ: اے دل، ویرانے میں الو کی طرح نہ بیٹھ۔ اڑ کر ان طائروں کے پاس پہنچ جا جن کا نشیمن عرش اعلیٰ پر ہے۔ زمین ایک ایسا درخت ہے جس میں شاخیں ہی شاخیں ہیں لیکن وہ تمام شاخیں ایک اصلیت یعنی جڑ کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں۔ ہر شاخ سے اصل کی طرف جانے کی راہ تلاش کر۔ جب وہ مل جائے تو شاخ کو چھوڑ دے۔ نئی نئی شاخوں پر بیٹھے رہنا عقل مند طائروں کا شیوہ نہیں۔)

(۸۱)

پرتھم ایک جو آپے آپ
نِرکر نرگن نرجاپ
نہیں تو آدِ انت مدھ تارا
نہیں تو انڈ دھندھ اُجیارا
نہیں تو بھومی پون آکاسا
نہیں تو پاوک نیر نواسا
نہیں تو سرسُتی جمنا گنگا
نہیں تو ساگر سمد ترنگا
نہیں تو پاپ پُن نہیں وید پُرانا
نہیں تو بھئے کتیب کُرانا
کہیں کبیر وچار کے تب کچھ کرپا ناہیں
برم پرش سہاں آپ ہی اگم اگو چرناہیں
کرتا کچھ کھاوے نہیں پیوے
کرتا کبھوں مرے نہ جیوے
کرتا کے کچھ روپ نہ ریکھا

کرتا کے کچھ برن نہ بھیکھا

جاکے جات گوت کچھ ناہیں

سہما برن نہ جائے موپاہیں

روپ اروپ نہیں تیرا ناؤں

برن ابرن نہی تیہہ ٹھاؤں

❋

ترجمہ:

ازل میں وہ ایک تھا اور اس کا اپنا وجود ہی اس کے لیے کافی تھا۔ وہ جس کا نہ رنگ ہے نہ روپ ہے، وہ جو بے صفات ہے۔ نہ تو ابتدا تھی، نہ ارتق (مدھ = وسط) نہ انتہا۔ نہ اندھیرا تھا، نہ دھندلکا تھا، نہ اجالا۔ نہ زمین تھی، نہ ہوا تھی، نہ آسمان، نہ آگ تھی نہ پانی۔ نہ گنگا، جمنا اور سرسوتی کے دھارے تھے، نہ سمندر تھا نہ موجیں۔ نہ گناہ تھا نہ ثواب، نہ وید پران تھے نہ قرآن۔ کبیر سوچ بچار کے بعد کہتے ہیں کہ تب کوئی حرکت اور جنبش نہیں تھی، ذات مطلق (پرم پرش = ذات الٰہی) اپنی خودی کی نامعلوم اور محدود گہرائیوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ خالق (کرتا = کرتار) نہ کچھ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ وہ نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے، اس کا نہ کوئی روپ ہے نہ ریکھ (لکیر)، نہ رنگ ہے نہ بھیس۔ نہ اس کی ذات پات ہے نہ گوتر۔ اس کی شان بیان سے باہر ہے۔ نہ وہ مشکل ہے نہ بے شکل (نہ خوبصورت ہے نہ بدصورت)۔ اس کا کوئی نام نہیں ہے۔ نہ وہ رنگ میں اسیر رہا اور نہ رنگ سے آزاد ہے۔ اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔

(یہ علم اگر ایک طرف ان معنوں میں خالص ویدانت ہے کہ برہما مکمل عدم اور مکمل خاموشی (شونیہ) ہے تو دوسری طرف ہمہ اوست کی تشریح ان معنوں میں ہے کہ کائنات کی کسی چیز سے الگ اس کا وجود نہیں۔ وہ سب کچھ ہے، الگ کچھ نہیں ہے۔)

(۸۴)

کہیں کبیر وچار کے جا کے بوں نہ گاؤں
نراکار اور نرگ، ہے بورن سب نہاؤں
کرت آنند کھیل لائی، اونکرتے سرشٹی اُپائی
آنند دھرتی آنند آکاس
آنند چند سور پرکاس
آنند آدِ انت مدھ تارا
آنند اندھ کوپ اجیارا
آنند ساگر سمدر ترنگی
آنند سرشٹی جما گنگا
کرتا ایک، اور سب کھیل
مرن جنم بِرہ میل
کھیل جل تھل سکل جہانا
کھیل جانوں جمی اسمانا
کھیل کا یہ سکل پسارا
کھیل مانہی رہے ستسارا

کہیں کبیر سب کھیل ماہیں

کھیل ہار کو جیسہیں ماہیں

❀

ترجمہ:

کبیر سوچ وچار کے بعد کہتے ہیں کہ وہ جس کی نہ کوئی ذات پات ہے نہ کوئی ٹھکانا، جو جسم سے پاک اور صفات سے بے نیاز ہے، اس کامل سے ساری کائنات بھری ہوئی ہے۔ وہ خالق ہے جس نے مسرت اور سعادت کا کھیل شروع کیا ہے اور اوم کے لفظ سے کائنات کی تخلیق کی ہے۔ زمین مسرت ہے، آسمان مسرت ہے، چاند کا نور اور سورج کی روشنی مسرت ہے، ازل مسرت ہے، ابد مسرت ہے، ارتقا مسرت ہے، اندھیرا مسرت ہے، اُجالا مسرت ہے، سمندر مسرت ہے، اس کی لہریں مسرت ہیں، مسرت ہیں گنگا اور جمنا اور سرسوتی کے دھارے۔ خالق ایک ہے، زندگی اور موت، ہجر اور وصال سب اس کے کھیل ہیں۔ کھیل پانی کا، کھیل مٹی کا، کھیل سارے جہان کا، کھیل زمین اور آسمان کا۔ کائنات کی سرشت میں کھیل ہے اور کھیل ہی میں ساری کائنات ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ ساری دنیا اس کا (حسین وجمیل) کھیل ہے لیکن کھیلنے والے کو کوئی نہیں پہچانتا۔

(۸۳)

جھی جھی جنتر باجے
کر چرن نہوتا ناچے
کر بن باجے سُنے شروَن بِن
شروَن شِروتا لوئی
پاٹ نہ سُباس سبھا بِن آوسر
بوجھو مُن جن سوئی

*

ترجمہ:

ساز بج رہا ہے۔ ہاتھ ہیں نہ پاؤں، لیکن ناچ ہو رہا ہے۔ انگلیاں نہیں لیکن نغمہ ہے، کان نہیں ہیں لیکن سنائی دے رہا ہے۔ وہی خود کان ہے اور وہی سننے والا۔ دروازہ بند ہے اور اندر خوشبو بھری ہے۔ کوئی محفل آرا نظر نہیں آتا لیکن محفل بھی ہوئی ہے۔ بوجھنے والے اسے بوجھ لیں گے۔ (یہ ترجمہ بھی ممکن ہے نہ تخت نہ دربار، پھر بھی محفل آراستہ ہے۔ جو اس کو سمجھ لے وہی محرمِ راز ہے۔)

(۸۴)

سور پھکروا مانگ جائے
میں تو دیکھوں نہ بولیوں
مگن سے کیا مانگیے
ہں مانگے جو دیبہ
کہیں کبیر میں ہوں واہی کو
ہونی ہونے سو ہونے

ترجمہ:

میرا فقیر مانگتا پھر رہا ہے لیکن میں نے تو اس کی جھلک بھی نہیں دیکھی۔ مانگنے والے سے میں کیا مانگوں، وہ تو ان مانگے دیتا ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ میں تو اس کا ہوں، جو ہونا ہے ہو جائے۔

(۸۵)

نیہر سے جیرا بھاٹ رے
نیہر نگری جن کے بگڑی، اس کا کیا گھر بات رے
تلک جیروا مور نہ لاگے، بن میں بہت اُجات رے
یا نگری میں بکھ درواجا، بیچ سمندر گھات رے
کیسے پار اترہیں سجنی، اگم پنتھ کا پات رے
عجب طرح کا بنا تمبورا، تار لگے مں مات رے
کھونٹی ٹوٹی تار بلگانا، کوؤ نہ بوجھت بات رے
ہنس ہنس پوچھے مات پتا سوں،
بھوریں سا شر جات رے
جو چاہیں سو وو ہی کری ہیں، پت واہی کے ہاتھ رے
نہائے دھوئے دلہن ہوئے بیٹھی، جو ہے پیا کی بات رے
تلک گھونگھٹوا دکھاؤ سکھی ری،
آج سوہاگ کی رات ہے
کہے کبیر سنو بھائی سادھو پیا ملن کی اس رے
بھور ہوت سدیے باد کرو گے، نیند نہ اوے کھات رے

ترجمہ:

ماں باپ کے گھر سے جی اکتا گیا ہے۔ جس کی یہ نگری بگڑ گئی اس کا نہ کوئی گھر ہے نہ راستہ۔ اب تو ذرا بھی جی نہیں لگتا، تن من اچاٹ رہتا ہے۔ اس نگری میں لاکھ دروازے ہیں لیکن بیچ میں سمندر حائل ہے۔ بھئی، میں کیسے پار اتروں، اس راستے کا کوئی اور چھور نہیں ہے۔

یہ تنبورا عجب ترکیب سے بنا ہوا ہے۔ جب اس کے تار بجنے لگتے ہیں تو دل نغمے میں کھو جاتا ہے لیکن جب کھونٹی ٹوٹ جاتی ہے اور تار الگ ہو جاتے ہیں تو پھر کوئی اس کی بات نہیں پوچھتا۔

میں ہنس ہنس کر ماں باپ سے پوچھتی ہوں کہ صبح ہوتے ہی سسرال جانا پڑے گا۔ وہ جو چاہیں گے کریں گے، اب تو عزت انھیں کے ہاتھ ہے۔ چوں کہ پیا کا انتظار ہے اس لیے نہا دھو کر دلہن بنی بیٹھی ہوں۔ سکھی، ذرا اپنا گھونگھٹ اٹھا، آ سہاگ کی رات ہے۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ پیا سے ملنے کی امید ہے۔ بستر پر لیٹ کر نیند نہیں آتی، صبح ہوگی تو مجھے یاد کرو گے۔

(۸۶)

جیو محل میں سو پہنُواں، کہاں کرت اُماد رے
پہوچھا دیوا کرلے سیوا، رین چلی آوت رے
جُگن جُگن کرے پنتجھن، صاحب کا دل لاگ رے
سوجھت نہیں پرم سُکھ ساگر، بنا پریم بیراگ رے
سُرون سُر نُھ صاحیب سے پورن پر گٹ بھاگ رے
کہے کبیر سو بھاگ ہمارا، پایا اچل سوہاگ رے

❋

ترجمہ:

زندگی کے محل میں خود تو مہمان ہیں۔ تو کہاں پاگل بنا پھر رہا ہے۔ اپنے دیوتا کی سیوا کرلے، رات بڑی تیزی سے چلی آرہی ہے۔ میرا انتظار کرتے کرتے نہ جانے کتنے جگ بیت گئے۔ مالک کا دل مجھ سے لگ گیا ہے۔ پریم اور بیراگ کے بغیر مسرت کا بحر بے کراں دکھائی نہیں دیتا، لیکن اب اپنے مالک سے محبت کا نغمہ سننے کے بعد میری قسمت جاگ اٹھی ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ ہمارے بھاگ کیسے اچھے ہیں کہ کبھی نہ ختم ہونے والا سہاگ ملا ہے۔

(۸۷)

گگن گھٹا گھہرائی سادھو، گگن گھٹا گھہرائی
پورب دس سے اٹھی ہے بدریا، رم جھم برسن لاگی
اپنی اپنی سیڑ سمہارو، نہیں جات بہ جائی
سُرت برت کی بیل بہائیں، کرے کھیت ترائی
دھان کاٹ مار گھر آوے، سونی کسل کسائی
دونوں تہار برابر پرسیں، جیوں مُنی اور گیانی

❋

ترجمہ:

آسمان پر بادل گرج رہے ہیں، سادھو آسمان پر بادل گرج رہے ہیں۔ پورب کی طرف سے گھٹا اٹھی ہے اور رم جھم رم جھم پانی برس رہا ہے۔ اپنے اپنے کھیت کی مینڈھ کو بچانے کی ترکیب کرو، نہیں تو پانی سب کا سب بہہ جائے گا۔ عشق اور بے تعلقی کے بیلوں کو بھٹکنے دو اور نجات کی کھیتی تیار کرلو۔ (یہ ترجمہ بھی ہوسکتا ہے سُرت اور برت کے بیلوں کو جوت کر نروان کی کھیتی کرلو۔) سمجھ دار کسان وہی ہے جو دھان کو کاٹ کر گھر لے آتا ہے اور دونوں تھالوں میں برابر کھانا نکالتا ہے جسے مُنی اور گیانی دونوں کھاتے ہیں۔

(۸۸)

آج دن کے میں جاؤں بلہاری
پریتم صاحیب آئے میرے پھونا،
گھر آنگن لگے سہونا
سب پیاس لگے منگل گائیں،
بھئے مگن لکھ چھب من بھاوں
چرن پکھاروں، بدن نہاروں
تن من دھن سب سائیں پے واروں
جا دن پائے پیا دھن سونی، بہوت آنند پرم سکھ ہونی
سُرت لگی سنت نام کی آسا، کہے کبیر داس کے داسا

*

ترجمہ:

اس دن پر نثار ہو جانے کو جی چاہتا ہے، آج پریتم مہمان آئے ہیں اور گھر آنگن سہانے لگ رہے ہیں۔ میری پیاس گیت گا رہی ہے اور خوش ہو کر اس کے دل موہ لینے والے حسن میں کھوئی جا رہی ہے۔ میں اس کے پاؤں دھوتی ہوں، اس کے چہرے کو (پیار سے) دیکھتی ہوں اور اپنا تن من دھن سب سائیں پر نچھاور کر دیتی

ہوں۔ یہ دن کتنا مبارک ہے کہ مجھے اپنے پیا کی دولت ملی ہے۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ داسوں کے داس کبیر کہتے ہیں کہ مجھے عشق ہو گیا ہے اور دل ست نام کے لیے تڑپ رہا ہے۔ (بدن = دن = چہرہ)

(۸۹)

کوئی سنتا ہے گیانی راگ گگن میں، اواج ہوئی بانی
سب گھٹ پورن پور رہا ہے، سب سُرن کے کھانی
جو تن پایا کھنڈ دیکھایا، ترسا سہی بجھانی
امرت چھوڑ کھنڈ رس چاکھا، ترسا تاپ تپانی
اون انگ سو انگ باجا باجے، سُرت نرت سمانی
کہیں کبیر سنو بھئی سادھو، سہی آد کی بانی

❋

ترجمہ:

ہے کوئی گیانی جو آسمان کے راگ کو سنے جیسے تیز بارش ہو رہی ہو۔ مکمل ذات نے ہر جسم کو اپنے وجود سے بھر دیا ہے اور سب کو سونے کی کان بنا دیا ہے۔ جس نے تن پایا لیکن صرف نیم حقیقت کو دیکھا اس کی پیاس کبھی نہیں بجھی۔ اس نے امرت کو چھوڑ کر ناقص رس چکھا اور تشنگی کی آگ میں جلتا رہا۔ اون انگ سو انگ کا راگ گونج رہا ہے اور سُرت (عشق) نرت (بیراگ) ایک ہو گئے ہیں۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ یہی ازلی نغمہ ہے۔

حاشیہ:

نظم ۱۷ کا پہلا بند بھی دیکھیے۔

گگن راگ دراصل ستاروں کا نغمہ ہے۔ کبیر نے اپنی کئی اور نظموں میں اس کو بار بار دہرایا ہے۔ مسلم فلسفیوں اور صوفی شاعروں کے یہاں یہ تصور موجود ہے۔ اس کی ابتدا یونانی مفکر فیثا غورس (Pythagorus) کے اس نظریے سے ہوتی ہے کہ سیاروں کے فاصلوں اور گردشوں کا توازن موسیقی کے اصولوں کی بنیادوں پر قائم ہے۔ مسلم فلسفیوں نے اس سے یہ نظریہ بنایا کہ سیاروں اور ستاروں سے نغمہ پیدا ہوتا ہے جو خدا کی حمد و ثنا کے لیے ہے اور اس نغمے کو پاک روحیں سن سکتی ہیں۔ اصول اوّل کے گرد گھومتے ہوئے ستاروں کی گردش عشق کا نتیجہ ہے۔ یہی نغمہ آسمان سے اتر کر زمین پر آیا ہے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں:

پس حکیماں گفتہ اند این لحن ہا
از دوار چرخ بگرفتیم ما
بانگ گردش ہائے چرخ است ایں کہ خلق
می سرایندش بہ طنبور و بہ حلق

(ترجمہ: پس فلسفیوں کا کہنا ہے کہ یہ مترنم آوازیں آسمان میں ناچتے ہوئے نورانی اجسام سے آتی ہیں۔ اور یہ نغمہ جو لوگ طنبور سے پیدا کرتے ہیں اور گلے سے نکالتے ہیں، گردش چرخ کا نغمہ ہے۔)

اس بنیاد پر صوفیوں نے سماع کو جائز قرار دیا ہے جبکہ اسلام میں موسیقی حرام ہے۔ چناں چہ مولانا رومی فرماتے ہیں کہ سماع دراصل "صوت بلی" سننے کا نام ہے اور انسان بے خود ہو کر وصال یار تک پہنچ جاتا ہے۔ (مثنوی کا انگریزی ترجمہ، از نکلسن، جلد ۸)

کبیر نے ایک نظم (نمبر ۳۹) میں انسانی جسم کو طنبورے کا نغمہ کہا ہے جس سے حضوری کا نغمہ نکلتا ہے۔

(۹۰)

میں کاسوں کہوں ایں پیہ کی بات رے
کہیں کبیر بچھڑ نہیں ملسہو
جیوں ترور جھوڑ بن دھام ری

ترجمہ:

میں اپنے پریتم کی بات کس سے کہوں۔ کبیر کہتے ہیں کہ ہجر کے بعد وصال ممکن نہیں ہے۔ جیسے پیڑ کو چھوڑ کر جنگل نہیں مل سکتا (ایسے ہی وہ محبوب خیال میں تلاش نہیں کیا جا سکتا)۔

حاشیہ:

اس نظم کا آخری مصرع مبہم ہے، ہندی اور اردو کے ترجمے دو مختلف اوقات میں کیے گئے تھے، اس لیے ان میں بہت بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ اردو کا ترجمہ ٹیگور کے کیے ہوئے انگریزی ترجمے سے زیادہ قریب ہے۔

(۹۱)

سنسکرت بھاشا پڑھ لیہا، گیانی لوگ کہو ری
اسا برسنا سیں بہہ گو سجی، کام کے تاپ سہو ری
مان سی کی مٹکی سر پر، بابک بوجھ مرو ری
مٹکی پٹک سلو پریم سے صاحب کبیر کہو ری

*

ترجمہ:

میں نے سنسکرت بھاشا پڑھ لی ہے۔ لوگو، اب مجھے گیانی کہو۔ (لیکن اس سے کیا فائدہ جب) پیاس بجھائے لیے جا رہی ہے اور خواہشوں کی آگ جلائے ڈال رہی ہے۔ غرور اور تکبر کا بوجھ سر پر اٹھائے پھرنا اور اس کے نیچے دب کر مرنا فضول ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ اس بوجھ کو پھینک دو اور پریتم کو، نک کہہ کر پکارو اور اس سے جا ملو۔

حاشیہ:

ہندوستانی کی جدید زبانوں مثلاً ہندی، اردو، مراٹھی، بنگالی، پنجابی وغیرہ کی ترقی میں صوفیوں اور سنتوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انھوں نے سنسکرت اور فارسی کو چھوڑ کر، جو مولویوں، حکمرانوں اور پنڈتوں کی زبانیں تھیں اور عوام کی دسترس سے بہت دور تھیں،

عوام کی بولیوں یعنی بھاشاؤں میں لکھنا شروع کیا۔ ہندی میں کبیر، ملک محمد جائسی، تلسی داس، سورداس، میرابائی اس کی سب سے زیادہ شاندار مثالیں ہیں۔

اس نظم میں کبیر نے سنسکرت کو غرور اور تکبر کی زبان قرار دیا ہے۔ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ سنسکرت تو کنویں کا پانی ہے اور بھاشا بہتی ہوئی ندی ہے (''سنسکرت ہے کوپ جل، بھاشا بہتا نیر'')۔ پنڈت سُندر لال نے اپنی کتاب ''کبیر اور انسانیت'' میں لکھا ہے کہ ''کاشی کے ہندوؤں میں ان دنوں سنسکرت کا زور تھا۔'' ظاہر ہے کہ کبیر ایسی زبان استعمال کرنا چاہتے تھے جو آسانی سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر سکے۔

(۹۲)

جر کھا چلے سُرت برہن کا
کایا نگری سی ات سُندر محل بنا جتن کا
سُرت ہنڈولی بوت گگن میں، پیڑھا گیان رتن کا
سہیں سوت برہن کا ہیں، ساجھا پریم بھگت کا
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو، مالا گونتھو دن رین کا
پیا مورائی ہیں پگار رکھی ہیں، آسو بھیٹ دیہوں میں کا

❁

ترجمہ:

پریم کی ماری برہن (جو اپنے پریتم سے جدا ہوگئی ہے) چرخہ چلا رہی ہے۔ جسم کا شہر اپنے سارے جلال و جمال کے ساتھ اُبھر رہا ہے اور اس کے اندر دل کا محل تعمیر ہو رہا ہے۔ آسمان پر پیار کے پھیرے پڑ رہے ہیں اور عرفان کے جواہرات کا بنا ہوا تخت بچھا ہے۔ برہن سوت کو مضبوط کات رہی ہے اور اس سے پریم اور بھگتی کا عروسی جوڑا تیار ہو رہا ہے۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ میں دن اور رات کی مالا گوندھ رہا ہوں۔ جب میرے پریتم آئیں گے اور (میرے گھر میں) اپنے قدم رکھیں گے تو میں اپنی آنکھوں کے آنسو نذر کروں گا۔

(۹۳)

کوٹن بھان، چندر، تارا گن، چھتر کی چھایہ رہائی
من میں من، نین میں نیا، من نیا اک ہو جائی
سُرت سوہاگن ملی پیا کو، تن کے سب دُکھائی
کہیں کبیر ملے پریم پورا، یہ میں سرت ملائی

❊

ترجمہ:

اس کی چھتر چھایا میں کروڑوں سورج، کروڑوں چاند اور کروڑوں تارے چمک رہے ہیں۔ اس کا دل میرے دل میں ہے، اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں ہیں۔ اب دل اور آنکھ دونوں ایک ہو گئے ہیں۔ پیار کی ماری سہاگن اپنے پریتم سے مل گئی ہے اور تن کی آنکھ بند کر کے من کی آنکھ کھول دی ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ پورا پریم اس وقت ملتا ہے جب اپنا پیار پریتم میں سما جاتا ہے۔

حاشیہ:

غالب کا تخیل حسن اور عشق کے مکمل وصال کے لیے ترستا رہا

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

وا کر دیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

لیکن کیسے نگاہوں کے اس فاصلے کو ختم کر دیا ہے اور وصل ہی وصل ہے۔ ایک دوہے میں اس خیال نے یہ شکل اختیار کی ہے

نینا انتر آ ڈاروں، جیوں ہوں نین جھپیوں
نا ہوں دیکھوں اور کوں، نا تجھ دیکھن دیوں

(پلک جھپکاتے ہی تو آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں، نہ خود کسی کو دیکھتا ہوں نہ تجھے دیکھنے دیتا ہوں۔)

ایک اور دوہا

نیناں کی کر کوٹری، پتلی پلنگ بچھائے
پلکوں کی چک ڈار کے پیا کو لیا رجھائے

(ترجمہ آنکھوں کی کوٹھری بنائی اور پتلی کا پلنگ بچھایا اور پلکوں کی چلمن ڈال کر پیا کو رجھا لیا۔)

(۹۴)

اودھو، بیگم دیس ہمارا

راجہ، رنک، بھکیر، بادشا، سب سے کہوں پکارا

جو تم چاہو پرم پد کو، ہمری ہو دیس ہمارا

جو تم آنے جھمیلے ہو کے، تجو من کی بھارا

دھرن، اکاس، گگن، کچھ ناہیں، نہیں چندر، نہیں تارا

ست دھرم کی ہیں مہاہیں، صاحب کے دربارا

کہیں کبیر سنو ہو بیارے، ست دھرم ہے سارا

❊

ترجمہ:

اودھو، ہمارا دیس وہ ہے جس میں کوئی غم نہیں ہے۔ یہ بات ہم راجہ اور بھکاری، فقیر اور بادشاہ سب سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔ اگر تم ذات الٰہی کے متلاشی ہو، ہمارے دیس میں آن بسو۔ اگر تم تھک کر چور ہو گئے ہو تو یہاں من کا بوجھ ہلکا کر لو۔ اس جگہ زمین، آسمان، چاند، تارے کچھ بھی نہیں۔ مالک کے دربار میں صرف ست دھرم (صداقت) کے مہتاب جگمگا رہے ہیں۔ پیارے بھائی سنو، کبیر کہتے ہیں کہ ست دھرم ہی سب کچھ ہے، باقی کچھ نہیں۔

(۹۵)

سائیں کے سنگ ساسُر آئی
سنگ نہ رہی، سُواد نہ جانو، گیو جوبن سپنے کے نائی
سکھی سہیلی منگل گاویں، سُکھ دُکھ مانھے ہردی چڑھائی
بھیو وِواہ، چلی پر دونھا، بات جات سمدھی سمجھائی
کہیں کبیر، ہم گوے جنی ہے، ترب کنت لے تور بجائی

❊

ترجمہ:

میں اپنے سوامی کے سنگ سسرال آئی۔ اس کے ساتھ رہی نہیں، وصال کا مزہ جانا نہیں۔ جوانی خواب کی طرح آئی اور چلی گئی۔ شادی کے دن سکھیوں نے گیت گائے اور ماتھے پر دکھ سکھ کی ہلدی لگائی۔ لیکن جب شادی ہو چکی تو میں بغیر دولھا کے چل دی۔ راستے میں رشتے داروں نے سمجھایا۔ کبیر کہتے ہیں ہم پریتم کے عشق کا گیت گاتے ہوئے گونے جائیں گے (رخصت ہوں گے)۔

(۹۶)

سُمُحھ دیکھ من مہت پیروا
عاشق ہو کر سونا کیا رے
پایا ہو تو دے لے پیا رے
پائے پائے پھر کھونا کیا رے
جب انکھین میں نیند گھنیری
تکیہ اور بچھونا کیا رے
کہیں کبیر پریم کا مارگ
سر دینا تو رونا کیا رے

*

ترجمہ:

دیکھ میرے دلدار، عاشق ہو کر سونا کیسا۔ وصل تیرا ہے تو اپنے وجود کو محو مرشد سے پا کر کھو دے کیا معنی رکھتا ہے۔ جب آنکھوں میں گھنیری نیند ہی ہو تو پھر تکیے اور بستر کی کیا ضرورت ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ عشق کی راہ میں سر دے کر رونا بے کار ہے۔

حاشیہ:

غالب نے کہا ہے

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو

نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

(۹۷)

نارد پیار سو انتر نلہیں
پیار جگے تب ہی جاگوں پیار سوے تب سوؤں
جو کوئی میرے پیار ڈکھاوے جڑا مول سوں کھوؤں
جہاں میرا پیار جس گاوے تہاں کروں میں باسا
پیار چلے آگے اُٹھ دھاؤں موہ پیار کی آسا
بے حد تیرتھ پیار کی چرنن کوٹ بھگت سمائے
کہیں کبیر پریم کی مہما پیار دیت بھجائے

*

ترجمہ:

او نارد، میرا محبوب مجھ سے دور نہیں ہے۔ جب پیار جاگتا ہے تو میں بھی جاگتا ہوں اور پیار سوتا ہے تو میں بھی سوتا ہوں۔ جو میرے محبوب کو دکھ پہنچاتا ہے اس کو میں نیست و نابود کر دیتا ہوں۔ میں وہاں رہتا ہوں جہاں میرے محبوب کا قصیدہ پڑھا جاتا ہے۔ جب وہ چلتا ہے تو اس سے پہلے اٹھ کر بھاگتا ہوں۔ مجھے صرف محبوب کا اشتیاق ہے۔ اس کے تیرتھ بہت ہیں اور اس کے قدموں میں کروڑوں عاشق بیٹھے ہوئے ہیں۔ کبیر کہتے ہیں کہ عشق کا راز صرف محبوب آشکار کرتا ہے۔

(۹۸)

کوئی پریم کی پینگ جھلاؤ رے
نیچ کے کھمبا اور پریم کے رس سے
تن من آج بھلاؤ رے
نینن بادل کی جھر لاؤ
شیام گھٹا اُر چھاؤ رے
آوت آوت شرت کی راہ پر
فکر پیا کو سناؤ رے
کہت کبیر سنو بھائی سادھو
پیا کو دھیان جت لاؤ رے

*

ترجمہ:

آج کوئی پریم کا جھولا جھلاؤ۔ محبوب کی بانہوں میں جھولا ڈال کے اور پریم کے رس سے سرشار ہو کے تن اور من کی پینگ بڑھاؤ۔ نینوں کی جھڑی لگاؤ اور دل پر کالی گھٹا چھا جانے دو۔ آتے آتے بالکل محبوب کے کان کے قریب آ جاؤ اور اسے اپنے دل کی بے قراری کا حال سناؤ۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ اپنے محبوب کے تصور میں ڈوب جاؤ۔

(۹۹)

امرت برسے ہیرا نپجے
گھنٹ پڑے ٹکسال
کبیر جلاہا بھیا پارشو
انبھئے اُتر پار
کبیر ہری رس یوں پیا
باکی رہی نہ تھاک
پاکا کلس کمہار کا
بُہری نہ چڑھنی چاک

❁

ترجمہ:

امرت برس رہا ہے اور ہیرا پیدا ہو رہا ہے۔ ٹکسال کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ کبیر جُلاہا جواہرات کا پرکھنے والا بن گیا ہے اور بغیر کسی خوف کے پار اتر گیا ہے۔ کبیر نے ہری رس (عشق حقیقی کی شراب) اس طرح پیا ہے کہ اب پیاس باقی نہیں رہ گئی۔ کمہار کا پکا گھڑا دوبارہ چاک پر نہیں چڑھتا۔

حاشیہ:

آخری دو مصرعوں میں دوبارہ پیدا ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ عمر خیام کی ایک رباعی میں موت صفات کو ترک کر کے عین ذات بن جانے کا نام ہے جسے اس نے عین حیات کہا ہے

ما ذات نہادہ در صفاتیم ہمہ
عین خرد و ذرۂ ذاتیم ہمہ
تا در صفتیم در ممماتیم ہمہ
چوں رفت صفت، عین حیاتیم ہمہ

(ترجمہ میں وہ ذات ہوں جو صفات میں گھری ہوئی ہے (سرگن کے اندر نرگن)۔ میں عین خرد ہوں لیکن چوں کہ صفات میں لپٹا ہوا ہوں اس لیے عین ذات کے سامنے مسخرہ معلوم ہوتا ہوں۔ جب تک صفات میں جکڑا ہوں تب تک موت میں مبتلا ہوں۔ جب صفات زائل ہو جائیں گی تو میں عین حیات بن جاؤں گا۔)

(۱۰۰)

ہوں تو سب ہی کی کہوں، موکوں کوؤ نہ جان
تب ہو بھلا اب بھی بھلا، جگ جگ سوؤں نہ آن
کن کھونا جگ آندھرا، سبد نہ مانے کوئے
جانے کہوں بت اپنا، سو انھ سری ہوئے
سس کا گج جھوٹو نہیں، کلم گہی نہیں ہات
چاروں جگ کو سہانہ مکھ ہی جانی بات
بولی ہماری پورو کی، ہمیں لکھے نہیں کوئے
ہم کو تو سونی لکھے، دھر پورب کا ہوئے

❊

ترجمہ:

میں تو سب کی کہتا ہوں لیکن مجھے کوئی نہیں جانتا۔ میں تب بھی بھلا تھا، اب بھی بھلا ہوں اور جگ بیت جانے کے بعد بھی مجھ میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ جگ کھوٹا ہے، دنیا اندھی ہے، شبد (حرفِ حق) کو کوئی نہیں جانتا۔ جس سے اس کے فائدے کی بات کرتا ہوں، وہی میرا دشمن ہو جاتا ہے۔ روشنائی اور کاغذ میں نے چھوا نہیں، قلم کو ہاتھ نہیں لگایا، چاروں یگوں کی تفسیر زبانی ہی بیان کی۔ میری بولی پورب کی ہے، اور اس لیے ہمیں کوئی خاطر میں نہیں لاتا، ہماری قدر تو وہ جانے جو خود پورب کیا ہو۔

(۱۰۱)

اودھو، قدرت کی گت نیاری

[illegible] وہ راجا، پھوس کرے بھکاری

[illegible] جہاں پھول نہ پھولے

مجھ شکاری رہے جنگل میں [illegible]

[illegible] جیوں دس [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ترجمہ:

"اے اودھو، قدرت کا کھیل عجیب و غریب ہے۔ اگر فقیر کو نوازے تو راجہ کر دے اور راجہ کو چاہے تو بھکاری بنا دے۔ یہ اسی کا کھیل ہے کہ دلدل میں پھل نہیں لگتا اور صندل جو مہکتا ہے پھل سے محروم ہے۔ (اگر وہ چاہے تو دلدل میں پھل لگ جائے اور صندل

میں پھول کھلائے گئیں۔) مگر مجھے شکار کے لیے جنگل میں گھومے اور شیر سمندر میں غوطے کھائے۔ ریڑ کا پیڑ صندل سے بھرے جنگلوں کا پہاڑ بن جائے اور چاروں طرف خوشبو پھیلنے لگے۔ اندھا بھی کائنات کے تینوں عالم (آسمان، دھرتی اور پاتال) کا تماشا دیکھے، لنگڑا آدمی سُمیر کے پربت کو پھاند جائے اور تینوں عالم میں آزادی سے گھومے۔ گونگا آدمی علم اور عرفان کی باتیں کرے اور الوہیت کا گیت گائے۔ اور اگر وہ چاہے تو آسمان کو پاتال میں پھینک دے اور شیش ناگ جو پاتال میں ہے اس کو جنت میں پہنچا دے۔ کبیر کہتے ہیں کہ رام (بھگوان) رہتے ہیں اور وہ جو کچھ کریں وہ انھیں زیب دیتا ہے۔

حاشیہ:

سُمیر، سونے کا ایک فرضی پہاڑ، پہاڑوں کا سرتاج۔

(۱۰۲)

اُلٹی جات کل دوؤ بساری
سن سہج سبھی نست بھاری
بھرا جھگڑا رہا نہ کوؤ
پنڈت مُلاّ جھانڑے دوؤ
نن نی آپ آپ پہراوں
جہاں نہیں آپ تہاں ہوئے گاوں
پنڈت مُلاّ جو لکھ دیا
جھانڑ چلے ہم کچھو نہ لیا
روے کیلاس نُر گھولے میرا
آگے کھوج کھوج ملے کبیرا

ترجمہ:

ہم نے ذات اور خاندان دونوں کو بھلا دیا ہے اور ہماری نیت شونیہ اور سہج میں جاری ہے۔ ہمارا جھگڑا ہی ختم نہیں رہا۔ پنڈت اور مُلا دونوں کو نکما اعلان کر دیا۔ آپ ہی بنتا ہوں اور آپ ہی پہنتا ہوں اور جہاں اپنے آپ کو نہیں پاتا وہاں جا کر گاتا ہوں۔

پنڈت اور ملا نے جو کچھ لکھا اس میں سے ہم نے کچھ بھی نہیں لیا۔ اے میر (جماعت کا پیشو)، دیکھ لے، میرا دل بالکل خالی ہے۔ اب کبیر اس منزل میں پہنچ گیا ہے کہ بہت تلاش کرنے کے بعد ملے گا۔

حاشیہ:

اپنے آپ کو مذہبی کتابوں سے آزاد کر لینے کا جذبہ بھگتی کے دوسرے مدرسوں میں بھی ملے گا۔ مثلاً کے ایم سین نے اپنی انگریزی کتاب ''ہندوازم'' میں بنگال کی باؤل تحریک کے ایک بھگت کا واقعہ لکھا ہے

''جب میں نے ایک باؤل سے پوچھا کہ وہ لوگ مذہبی کتابوں کو کیوں نہیں مانتے تو اس نے ذرا خفا ہو کر جواب دیا کہ ہم اپنے کارنامے پر فخر کرتے ہیں۔ جو اپنے باپ دادا کے کارناموں پر ناز کرتے رہتے ہیں وہ بزدل اور کمزور ہیں۔ ان میں خود کوئی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی۔''

کبیر نے بھی ایک دوہے میں کہا ہے۔

ساکھی لائے جتن کر، ات اُت اکھر کاٹ
کہے کبیر کب لگ جیئے، جھوٹی پتل چاٹ

(ترجمہ ادھر اُدھر سے حرف جمع کر کے نصیحت نامہ تیار کیا گیا ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ اس طرح جھوٹے پتل چاٹ کر کب تک زندہ رہو گے۔)

سہج: جو ساتھ پیدا ہوا ہو، فطری، بے ساختہ، بے تکلف۔

شونیہ: خلا، سناٹا، بے صفات ذات مطلق۔

کھلاس: خلاص۔

میرا: اے امیر، اے پنچ۔

(۱۰۳)

بوجھو پنڈت، کر بوجھ، پڑش ایہے کہ ناری
[illegible] کے گھر [illegible] ہوئی، ہو گئی کے گھر جنمی
[illegible] پڑھ پڑھ بھئی نرکی، کنی [illegible] رہی اکیلی
[illegible] کرنی، [illegible] ہو سہاری
[illegible] اب سی اد کنواری
[illegible] سنگ سوئے
[illegible] کہوئے

ترجمہ

[illegible] (مایا) مرد ہے یا عورت۔ برہمن کے گھر وہ [illegible] ہوتی ہے اور یوگی کے گھر چیلی بن جاتی ہے۔ قلمہ پڑھ کر وہ مسلمان ہو جاتی ہے اور پھر بھی اس تمام جھگڑے میں سب سے الگ رہتی ہے۔ شوہر نہیں رکھتی، بیاہ نہیں [illegible] ہے۔ [illegible] ایک کو بھی نہیں چھوڑتی ہے پھر بھی ہمیشہ کی کنواری ہے۔ [illegible] نہیں، [illegible] نہیں، لیکن سائیں کے ساتھ سوتی ضرور ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ وہ (مایا) [illegible] پت، کسی خاندان [illegible] نہیں رکھتی، بگڑ رہی ہے۔

حاشیہ

حافظ شیرازی نے بھی دنیا (سنسار = مایا) کو ایک ایسی عورت سے تشبیہ دی ہے جس کے ہزاروں شوہر ہیں۔ ''کہ این عجوزہ عروس ہزار داماد است''

کبیر کی نظم کا آخری مصرع اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں مایا کو زانی کہا گیا ہے۔ اس خیال کا سلسلہ رامانُج کے وششٹ ادویت سے جا ملتا ہے۔ (دیکھیے دیباچہ، کبیر کے مایا کے تصور پر نوٹ)۔

(۱۰۴)

رام تیری مایا دُند مچاوے

گت مت وا کی سمجھ پڑے نہیں، سر نر مُنی ہی نچاوے

کا سمیر کے سا کھا بڑھیے، پھول انوپم نانی

کتنک چلک لاگ رہے ہیں، چا کھت سُوا اڑانی

کہا کھجور بڑائی تیری، کل کوئی سہیں پاوے

گرکھم رُت اب آئی نُکاسی، چھایا کام نہ آوے

ایسا جنُر اور کو سکھیے، کاس، کنک، سیاسی

کہیں کبیر سنو ہو سنتو، رام جپن رب ناسی

❊

ترجمہ:

رام، تیری مایا دُند مچا رہی ہے۔ اس کی کیفیت سمجھ میں نہیں آتی۔ دیوتا، انسان، رشی اور منی سب کو نچاتی رہتی ہے۔ مایا نے سیمل کی شاخ کی طرح جو یہ اپنی شاخیں پھیلا رکھی ہیں اس سے کیا فائدہ۔ طرح طرح کے پھول کھلتے ہیں، کتنے ہی پپیہے آ کر بیٹھتے ہیں اور طوطے پھل کھا کر اڑ جاتے ہیں۔ کھجور کے پیڑ، تیری بڑائی بے کار ہے، تجھ سے کسی کو آرام نہیں ملتا۔ گرمی کا طولانی موسم آ گیا ہے اور تیرا سایہ کام نہیں آتا۔ مایا اپنی

چالاکی اوروں کو سکھا دیتی ہے اور عورت اور سونے میں یہی سیانا پن اور دھوکا ہے۔ سنو سنتو، کبیر کہتے ہیں کہ ہم نے تو رام (بھگوان) کے چرنوں سے لو لگانے کا راستہ اختیار کیا ہے۔

حاشیہ:

رت میں نے اس کا ترجمہ مصرعے کے پورے مفہوم کے اعتبار سے سے لو لگانا کیا ہے۔ رت جنسی جذبے کو بھی کہتے ہیں اور یہ عشق کے دیوتا کام دیو کی بیوی کا بھی نام ہے۔

(۱۰۵)

ای مایا رگھناتھ کی بوری، کھیلن چلی اہیرا ہو
جبر جکت جن جن مارے، کاہُ نہ راکھے نیرا ہو
موہی، بیر، دگمبر مارے، دھیان دھرنے جوگی ہو
جنگل میں جنگم مارے، ماپا کنھہ ہوں نہ بھوگی ہو
بید پڑھنے بدوا مارے، پُجا کرنے سامی ہو
اربھ وچارت پنڈت مارے، باندھیو سکل نگامی ہو
سنگی رشی ہی بھیتر مارے، سر برھما کی بھوری ہو
ناتھ مچھندر چلے بھیتر دے، سنگھلدیپ میں بوری ہو
ساکت کے گھر کرما دھرنا بری بھگتن کی جیری ہو
کہیں کبیر سنو ہو سنتو، جوں واے توں بھیری ہو

*

ترجمہ

یہ مایا جو رگھوناتھ (بھگوان) کی دیوانی ہے، شکار کھیلنے گلی ہے۔ بڑے بڑے چاک اور سبک دست آدمیوں کو چن چن کر مارتی ہے اور کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دیتی۔ کہیں وہ موہی، بیر اور دگمبر کو مارتی ہے اور کہیں دھیان میں کھوئے ہوئے جوگی کو، اور

کہیں جنگلوں میں رہنے والے جنگم سادھوؤں کو۔ غرض مایا سے کوئی فیض یاب نہیں ہو سکا۔ وہ وید پڑھتے ہوئے برہمنوں کو بھی مار لیتی ہے اور پوجا کرتے ہوئے سوامیوں کو بھی اور تفسیر بیان کرتے ہوئے پنڈتوں کو بھی۔ اس نے سب کے منہ میں لگام لگا دی ہے۔ وہ جنگل میں جا کر سنگی رشی کو مارتی ہے اور برہما کا سر پھوڑ دیتی ہے۔ اس کے فریب نے مچھندر ناتھ کو بھی، جو مایا کی طرف سے پیٹھ موڑ کر چلے تھے، لنکا میں جا کے ڈبو دیا۔ مایا دنیادار کے گھر میں کرتا دھرتا بن بیٹھتی ہے لیکن ہری کی بھگتی میں کھوئے ہوئے لوگوں کی کنیز ہو جاتی ہے۔

حاشیہ:

اہیرا اہیڑ = شکار۔

نیرا قریب۔

مونی: خاموش رہنے والے سادھو

بیر: شو بھگتوں کی ایک قسم۔

دگمبر جینی فقیر جو ننگے رہتے ہیں اور تمام دشاؤں (سمتوں) کو اپنا لباس سمجھتے ہیں۔

سنگی ایک رشی کا نام جو جنگل میں تپسیا کرتے تھے اور ایک عورت پر عاشق ہو گئے تھے۔

برہما کا سر پھوڑنا: مراد عقل یا عقل برہما کا مقام ہے۔ اس لیے اس کا مطلب ہوا عقل کا قتل۔

مچھندر ناتھ: سدھ یوگی تھے جو لنکا کی عورتوں پر عاشق ہو گئے تھے۔

ساکت: شکتی کو ماننے والا، غرور اور طاقت سے کام لینے والا۔

(۱۰۶)

بانگڑ دیس لُوؤں کا گھر ہے،
تہاں جن جائی داجھن کا ڈر ہے
سب جگ دیکھوں کوئی نہ دھیرا،
پرت دھور سر کہت ابیرا
نہ تہاں سروور نہ تہاں پانی،
نہ تہاں ست گر سادھو وانی
نہ تہاں کوکل نہ تہاں سوواہ،
اونجے چڑھ چڑھ ہنسا سووا
دیس مالوا گہر گمبھیر، ڈگ ڈگ روٹی پگ پگ نیر

*

ترجمہ:

بانگڑ دیس (مغربی علاقہ) گرم لوؤں کا دیس ہے۔ وہاں مت جاؤ، جل جانے کا ڈر ہے۔ میں ساری دنیا کو دیکھتا ہوں، کسی کے دل میں صبر قناعت نہیں ہے۔ سر پر جو خاک پڑتی ہے اسے وہ عبیر سمجھتے ہیں۔ نہ وہاں جھیل ہے نہ پانی، نہ ست گرو ہیں نہ سادھو کی آواز (صدائے حق)، نہ وہاں کوئل ہے نہ طوطا، اور ہنس اونچا اڑتے اڑتے مر

گیا۔ لیکن مالوے کا دیس گہر گمبھیر ہے۔ وہاں قدم قدم پر روٹی اور قدم قدم پر پانی ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ اس دنیا کی حیثیت اعتباری ہے۔ گونگا گڑ کھا کر اس کا مزہ بیان نہیں کر سکتا۔

حاشیہ:

اس نظم کا مفہوم واضح نہیں ہے۔ بانگڑ دیش اور مالوے کی کیا اہمیت ہے پتا نہیں چلتا۔ بانگڑ اس علاقے کا قدیم نام ہے جسے ہریانہ کہتے ہیں۔ مالوے کا علاقہ وسط ہندوستان میں ہے جہاں کی راتیں بڑی سہانی ہوتی ہیں۔ اس علاقے کو کبیر نے ''گہر گمبھیر'' کہا ہے یعنی وسیع، بیکراں، اتھاہ۔ اس اعتبار سے بانگڑ دیش کا مطلب ہوگا اونچا یا بلند خشک پتھاروں کا علاقہ۔ کبیر چوں کہ گرہستی تھے اور کپڑا بن کر اپنی روزی کماتے تھے اس لیے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ بانگڑ دیش سے مراد ترک دنیا ہے اور گہر گمبھیر مالوے سے مراد دنیا کو برتنا ہے۔ نظم کے آخر میں کبیر نے دنیا کو اعتباری کہا ہے

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

(میر تقی میر)

(۱۰۷)

رہنا نہیں دیس برانا ہے
یہ سنسار کاگد کی پڑیا، بوند پڑے گھل جانا ہے
یہ سنسار کانٹ کی باڑی، الجھ پُلجھ مر جانا ہے
یہ سنسار جھاڑ او جھنکر، آگ لگے مر جانا ہے
کہت کبیر سنو بھائی سادھو، ست گرو نام ٹھکانا ہے

❊

ترجمہ:

یہ پرایا دیس ہے، یہاں نہیں رہنا ہے۔ یہ سنسار کاغذ کی پڑیا ہے جو ایک بوند پانی سے گل جاتی ہے۔ یہ کانٹوں کی جھاڑی ہے جس میں الجھ کر لوگ مر جاتے ہیں۔ یہ جھاڑ جھنکاڑ ہے جو آگ لگتے ہی جل جاتا ہے۔ کبیر کہتے ہیں سنو بھائی سادھو، اصل منزل ست گرو کا نام ہے۔

حاشیہ:

صبح دم طائران خوش الحان — پڑھتے ہیں کل من علیہا فان
جائے عبرت سرائے فانی ہے — مورد مرگ ناگہانی ہے (شوق)

(۱۰۸)

"تمھ گھر جاؤ ہماری بہناء وش لاگی تمھارے نیاں
اُنھں چھانڑ نریحں راجے، ناکسی بیں کا دیاں
بل جاؤں تاکی جن تمھہ پٹھنی، ایک بھائی ایت نہیاں"
"رانی کھانڈی دیکھ ہمارا سنگارو
سُرگ لوک نہیں ہم جل انی کرن کبیر بھرتاری"
"سرگ لوک میں کیا دکھ پڑیاء تمھہ انی کل ماہیں
جات جلا یا نام کبیرا، اج ہوں پہنچو ناہیں
تہاں جاؤ جہاں ہات پتمبر، اگر چندن گھس لیں
اُنی ہمارے کہا کرو گی، ہم تو جات کمیاں
جن ہم ساجے ساجیہ نواجے، باندھے کاجے دھاگے
جے تمھہ جتن کرو نہیرا، پانی آگ نہ لاگے
صاحب میرا لیکھا مانگے، لیکھا کیوں کر دیجے
جے تمھہ جتن کرو نہیرا تو پانی نیر نہ بھیجے
جا کی من مچھی سو میرا مچھا سو میرا رکھوالو
تُلک ایک تمہارے ہاتھ لگاؤں تو راجا رام رسالو

جات جُلاہا کبیرا ہن بھروں اُپاسی

آس پاس سمہہ بھر بھر دیسو ایک ماؤ ایک ماسی"

❁

ترجمہ:

"میری بہن (مایا)، تم اپنے گھر جاؤ، تمھاری آنکھیں مجھے زہر لگ رہی ہیں۔ میں نے صفات کو چھوڑ کر ذات سے لو لگائی ہے، اب مجھے کسی سے کچھ لینا دینا نہیں۔ میں اس کے قربان جاؤں جس نے تمھیں بھیجا ہے، ہم دونوں تو بہن بھائی ہیں۔"

"اس لال نکوار کو دیکھو کبیر، میرا سنگار دیکھو، میں جنت سے اتر کر آئی ہوں اور کبیر میں تمھیں اپنا دولھا بنانا چاہتی ہوں۔"

"جنت میں تمھیں کیا دکھ تھا جو تم نے اس کل جگی دنیا میں آنے کی تکلیف گوارا کی؟ ہماری ذات جلاہے کی ہے اور نام کبیر ہے، ہمیں تو کبھی کسی نے پوچھا نہیں۔ تم وہاں جاؤ جہاں تخت بچھے ہیں، باغ آراستہ ہیں، اناج کے بورے بھرے ہیں، ریشم کی بھرمار ہے، اگر اور صندل گھسا جا رہا ہے۔ ہمارے پاس آ کر کیا کرو گی، ہم تو کمینوں کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس نے ہمیں پیدا کیا ہے اور جس کی نوازش ہم پر ہے، اس نے ہمیں اپنے پیار کے کچے دھاگے میں باندھ رکھا ہے۔ تم چاہے جتنے جتن کرو، پانی میں آگ نہیں لگا سکو گی (مجھے اپنی طرف مائل نہیں کر سکو گی)۔ میرا مالک تو اعمال نامہ مانگتا ہے، وہ میں اسے کیسے دکھاؤں گا۔ تم چاہے جتنے جتن کرو پتھر میں پانی جذب نہیں ہو سکتا۔ میں جس کی مچھلی ہوں وہی میرا مچھیرا ہے، وہی میرا رکھوالا ہے۔ اگر تمھیں ہاتھ بھی لگا دوں تو رام مجھ سے روٹھ جائیں گے۔ میری تو جلاہے کی ذات ہے اور میں جنگل جنگل بھوکا پیاسا مارا پھرتا ہوں۔ تم میرے آس پاس گھومو اور بیٹھو۔ ہماری ماں اور خالہ ایک ہی ہے (یعنی ہم سگے بہن بھائی ہیں)۔

(۱۰۹)

مایا مہاٹھگنی ہم جانی

ترگن پھاس لیے کر ڈولے، بولے مدھری بانی
کیشو کے کملا ہوئی بیٹھی، شو کے بھون بھوانی
پنڈا کے مورت ہوئی بیٹھی، تیرتھ میں پانی
جوگی کے جوگن ہوئی بیٹھی، راجا کے گھر رانی
کاہو کے ہیرا ہوئی بیٹھی، کاہو کے کوڑی کانی
بھگتن کے بھگتن ہوئی بیٹھی، برہما کے برہمانی
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو، یہ سب اکہو کہانی

❀

ترجمہ:

ہم مایا کو بہت بڑی ٹھگنی سمجھتے ہیں۔ اس کے ہاتھ میں ترگن کی پھانسی کا پھندا ہے اور ہونٹوں پر میٹھے بول۔ کیشو (وشنو) کے یہاں ملا (لکشمی) بن بیٹھی اور شو کے یہاں بھوانی۔ پنڈا کے گھر مورت بن بیٹھی اور تیرتھ میں پانی۔ جوگی کے گھر میں جوگن ہوئی اور راجہ کے گھر رانی۔ کسی کے یہاں ہیرا بن کر آئی اور کسی کے یہاں کانی کوڑی۔ بھگتوں کے یہاں بھگتن ہوگئی اور برہما کے گھر برہمانی۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں

کہ یہ ناقابلِ بیان کہانی ہے۔

حاشیہ:

ترگن پھانس (ترگن کا پھندا) قدیم ہندو فکر کے مطابق مادے یا پراکرتی کی تین صفات (گن) ہیں۔ (۱) تمس یعنی جمود، سکون، بے حرکتی، (۲) رجس یعنی حرکت، عمل، (۳) ستو یعنی تناؤ یا آہنگ اور تناسب۔ یہ تینوں صفات مل کر مادے کی اصل حقیقت بن جاتی ہیں۔ بٹی ہوئی رسی کی طرح یہ تینوں صفات (گن) ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہیں۔ پہلے گن کی زیادتی انسان کو سست، کاہل، اور کینہ پرور بنا دیتی ہے، دوسرے گن کی زیادتی غرور اور شجاعت پیدا کرتی ہے، اور تیسرے گن کی زیادتی متوازن طبیعت اور سمجھ داری کی ذمے دار ہے، بالترتیب ان کا رنگ سیاہ، سرخ اور سفید ہے۔

کیسو کیشو = خوبصورت بالوں والا، وشنو کا ایک اور نام۔ (ویسے یہ نام کرشن جی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے کیوں کہ وہ وشنو کے اوتار ہیں۔)

بھوانی شو کی بیوی پاروتی یا دُرگا کا ایک اور نام۔ بھوانی دیوی تھگوں کی رکھوالی ہے اور چیچک کی بھی دیوی سمجھی جاتی ہے۔

کملا لکشمی، دیوی کا ایک اور نام، مکمل عورت۔

برہمانی برہما کی مونث۔ کبیر کی ایچ معلوم ہوتی ہے۔

(۱۱۰)

یا کریم بلِ حکمت تیری
کھاک ایک صورت بُہتیری
اردہ گگن میں نیر جمایا
بہت بھانت کرِ نورن پایا
اولیا آدم پیر مُلانا
تیری صفت کر بھیئے دوانا
کہے کبیر بُہہ بہیٹ بچارا
یارب یارب یار ہمارا

ترجمہ:

اے کریم، میں تیری حکمت پر قربان جاؤں، خاک ایک ہے لیکن صورتیں ہزاروں ہیں۔ تو نے وسط آسمان میں پانی کو قائم کیا اور طرح طرح سے نور پھیلایا ہے۔ اولیاء، آدم، پیر، مولوی سب تیری صفات بیان کرتے کرتے دیوانے ہو گئے۔ کبیر کہتے ہیں کہ ہم نے تو بس یہ نکتہ سوچا ہے کہ یارب ہمارا یار ہے۔

(III)

پانڈے بوجھ پیو تم پانی

جہی مٹیا کے گھر ماں بیٹھے، تا ماں سرشٹ سمانی

جہیں کوئی حدو جہاں بھیجے، مُن جن سپھس اٹھاسی

پگ پگ پیگمبر گئے، سو سب سر بھو ماٹی

نے ہی مٹیا کے بھانڈے بانڑے، بوجھ ہی ہو تم پانی

مجھو کچھ گھر بار بیاپے، ادھر ہر جل بھریا

مدب ہر برک بھی اوے، پنی ماس سب سریا

بار جھری جھر گود گری گر، دودھ کہاں تیں آیا

سوئے بانڑے جیوں بیٹھے، سٹھابیں جھوٹ لگایا

بید کتیب جھاڑ دیو بانڑے، ای سب من کے بھرما

کہیں کبیر سو ہو بانڑے، ای سمجھے بیں کرم

❁

ترجمہ:

یہ تمھاری حماقت ہے پانڈے، کہ تم پہلے ذات پوچھتے ہو پھر اس کے ہاتھ کا پانی پیتے ہو۔ تم جس مٹی کے گھر میں بیٹھے ہو اس میں ساری کائنات (سرشٹ = سرشٹی =

فطرت = تخلیق) سمائی ہوئی ہے۔ چھپن کروڑ یادو اور اٹھاسی ہزار مُنی یہاں غرق ہو گئے ہیں اور قدم قدم پر گڑے ہوئے پیغمبروں کی لاشیں سڑ کر مٹی ہو گئی ہیں۔ اے پانڈے، یہ برتن اسی مٹی کے ہیں اور تم ذات پوچھ کے پانی پیتے ہو۔ اس پانی میں مگرمچھ، کچھوے اور گھڑیال بچے دیتے ہیں اور ان کا خون پانی میں مل جاتا ہے۔ اس ندی کے پانی میں سارا نرک (گندی چیز = دوزخ) بہہ کر آتا ہے اور جانور اور انسان سب اس میں سڑتے ہیں۔ جب ہڈی اور گودا گل جاتا ہے تب دودھ بنتا ہے۔ اس دودھ کو لے کر پانڈے کھانا کھانے بیٹھتے ہیں لیکن ساری چھوت چھات مٹی ہی میں مانتے ہیں۔ اے پانڈے جی، وید اور قرآن سب کو چھوڑ دو، یہ سب دل کے دھوکے ہیں۔ سنو پانڈے جی، کبیر کہتے ہیں کہ یہ تمھارے کرم ہیں جو تمھارے سامنے آتے ہیں۔

حاشیہ:

معلوم نہیں چھپن کروڑ اور اٹھاسی ہزار کی تعداد کی کیا اہمیت ہے لیکن اشارہ یادو قبیلے کے ڈوبنے کی طرف ہے۔ ایک چندر ونشی راجا یاتی کا بیٹا یدو تھا۔ اس کی نسل یادو کہلائی جس میں کرشن پیدا ہوئے۔ کرشن جی کی پیدائش کے وقت وہ لوگ گوالے تھے لیکن آخر میں دوارکا (گجرات) میں ان کی سلطنت قائم ہوئی۔ کرشن جی کے بعد جب دوارکا شہر سمندر کی طوفانی لہروں میں ڈوب گیا تو یہ لوگ بھی غرق ہو گئے۔ وشنو پُران میں ان کی تعداد لاکھوں اور کروڑوں بتائی گئی ہے۔

اس نظم میں جس خیال کا اظہار کیا گیا ہے اس کی تائید میں دو واقعے بھی بیان کیے جاتے ہیں۔

کبیر کی بیٹی کمالی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایک دن کنویں پر پانی بھر رہی تھی، ایک پیاسے براہمن نے اس سے پانی مانگا۔ پانی پی کر جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ کمالی جُلاہے کی بیٹی ہے تو بہت خفا ہوا اور کہنے لگا کہ تو نے مجھے بے دھرم کر دیا۔ دونوں کبیر

کے پاس آئے۔ کبیر نے براہمن دیوتا کو بتایا کہ آخر سمجھو تو پاک اور ناپاک کیا چیز ہے۔ سیکڑوں لاشیں اور منوں چیاں پانی میں سڑا کرتی ہیں، کروڑوں آدمی زمین میں دفن ہیں اور اس مٹی سے وہ برتن بنائے جاتے ہیں جن میں تم پانی پیتے اور کھانا کھاتے ہو۔ کھانا کھاتے وقت تم کپڑے اتار ڈالتے ہو، صرف ایک دھوتی باندھے رہتے ہو مگر وہ دھوتی جلاہے کی بُنی ہوئی ہوتی ہے۔ مکھیں غلیظ اور مردار پر بیٹھتی ہیں اور وہاں سے اُڑ کر تمھارے کھانے پر بیٹھتی ہیں کیا۔ تم اُن کو روک سکتے ہو؟ اسی طرح کا ایک اور واقعہ ''دبستان مذاہب'' میں درج ہے۔

''کہتے ہیں کچھ براہمن گنگا کنارے بیٹھے ہوئے گنگا جل کی تعریف کر رہے تھے کہ اس سے سارے گناہ دھل جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے پانی مانگا۔ کبیر ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اٹھ کر گیا اور اپنا پیالہ پانی سے بھر کر براہمن کے پاس لے آیا۔ چوں کہ کبیر جلاہا تھا اور براہمن ان لوگوں کے ہاتھ کا چھوا ہوا کھاتے پیتے نہیں ہیں، اس براہمن نے پانی نہیں پیا۔ کبیر نے کہا کہ آپ ابھی فرماتے تھے کہ گنگا جل سے گندگی سے بدن اور روح دھل جاتے ہیں۔ اگر یہ پانی میرے برتن کو بھی پاک نہیں کر سکتا تو اس تعریف کے قابل نہیں۔'' (کبیر صاحب، مولفہ پنڈت منوہر لال زتشی، مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، ۱۹۳۰ء۔)

(۱۱۲)

سادھو، پانڈے نِپُن کسائی

بکری مارِ بھیڑ کو دھائے، دل میں درد نہ آنی

کر اسنان تلک دے بیٹھے بدھی سوں دیو پُجائی

آتم مار پلک میں بیسے، رُدھر کی ندی بہائی

اتی پُنیت اونچے کل کہیے، سبھا مانھہ ادھکائی

ان سے دِجھا سب کوئی مانگے، بسی آوے موسہہ بھائی

پاپ کش کو کنھا سماویں، کرم کراویں بھجا

بوڑت دوڑ پرسپر دیکھے گہے ہاتھہ ہم کھیجا

گانے بدھے سو ترک کہاوے نہ کبا ان سے چھوٹے

کہیں کبیر سنو بھائی سادھو، کل میں ناسہں کھوٹے

❁

ترجمہ:

اے سادھو، یہ پنڈے بڑے مشاق قصائی ہیں، بکری کا بلیدان کر کے بھیڑ کی طرف لپکتے ہیں۔ ان کے دل میں ذرا بھی رحم نہیں۔ اشنان کر کے اور تلک لگا کے بیٹھتے ہیں اور بڑی باقاعدگی سے دیوتا کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ اپنی آتما کو ایک پل میں مار دیتے ہیں اور خون کی ندی بہا دیتے ہیں۔ یہ بہت مقدس ہیں اور اونچے خاندان کے ہیں اور

سمجھ میں ان کی بڑی مان دان ہے۔ ان سے سب لوگ علم اور عرفان حاصل کرتے ہیں اور مجھے یہ تماشا دیکھ کے ہنسی آتی ہے۔ لوگوں کا پاپ کاٹنے کے لیے یہ کتھا سناتے ہیں اور کام ان سے بہت نیچے کرواتے ہیں۔ میں نے دونوں کو ایک ساتھ ڈوبتے دیکھا ہے، جس کو انھوں نے سہارا دیا اس کو لے ڈوبے۔ جو گائے کو مارے وہ مسلمان کہلاتا ہے لیکن کیا یہ پانڈے ان مسلمانوں سے کچھ کم ہیں۔ کبیر کہتے ہیں کلجگ میں برہمن بہت کھوٹے ہو گئے ہیں۔

(۱۱۳)

پانڑے نہ کرسی باد بیادم
باد بھی بِن شبد نہ سوادم
انڈ برہمنڈ کھنڈ بھی ماٹی
ماٹی نو بندہ کایا
ماٹی کھوجت سنت گرؤ بھیٹیا
تن کچھ الکھ لکھایا
جیوت ماٹی سووا بھی ماٹی
دیکھ گیان بچاری
اب کالی ماٹی میں واسا
لیٹے پاؤں پساری
ماٹی کا جتر بون کا تھمبھا
وِپند سنجوگ اُپایا
بھاسیں گھڑے سنوارے سوئی
یُہہ گووند کی مایا
ماٹی کا مندر گیان کا دیپک

بون بات اُجیارا

تبھی اُجیارے سب جگ سوجھے

کبیر گیان بچارا

٭

ترجمہ:

دیکھو پانڈے، فضول بحث مباحثہ نہ کرو۔ اس جسم کے بغیر نہ تو شبد (صوت سرمدی) ہے اور نہ شبد کا مزہ۔ یہ کرۂ زمین، یہ کائنات، اس کا جزو اور کل سب مٹی ہے۔ یہ نو ندھیوں کی کایا (یعنی جسم بھی جو طرح طرح کے خزانوں سے معمور ہے) مٹی ہے۔ اس مٹی کی تلاش میں (یعنی اپنے آپ کو پہچاننے میں) ست گرو سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے تھوڑے سے اشارے سے پردہ اٹھایا (ان دیکھے کو دکھایا)۔ ذرا گیان دھیان سے کام لو تو معلوم ہوگا کہ زندہ بھی مٹی ہے اور مُردہ بھی مٹی ہے۔ اس بے حد کالی مٹی میں ہماری رہائش ہے اور ہم اس میں پاؤں پھیلائے لیٹے ہوئے ہیں۔ ہوا کے ستون پر آویزاں یہ مٹی کی بنی ہوئی تصویر وہ شکل ہے جسے ایک نقطے نے ظاہر کیا ہے۔ یہ گووند (بھگوان) کی شفقت کا کرشمہ ہے کہ وہ اس مٹی کو توڑتا، بناتا اور سنوارتا رہتا ہے۔ مٹی کا مندر ہے جس میں عرفان کا چراغ جل رہا ہے اور ہوا کی بتی کا اجالا پھیل رہا ہے۔ کبیر سوامی بچارے کہتے ہیں کہ اس روشنی میں سارا جگ دکھائی دیتا ہے۔

حاشیہ:

بادبیوم (۱۰۰۰۰۰) بحث مباحثہ۔

نو ندھ کایا: نو ندھیوں سے معمور جسم، ندھ خزانے کو کہتے ہیں۔ نو ندھ دولت کے دیوتا کوبیر کے نو خزانے ہیں، اور ہر خزانے کی محافظ ایک ایک روح ہے جن کی پرستش تانترک دھرم میں کی جاتی ہے۔ ان سب کے الگ الگ نام ہیں۔

اَت بے حد

واسار رہنے کی جگہ

اُبارنا، بے نقاب کرنا

وبند (بندو) نقطہ۔ غالب نے کہا ہے

سخن یکے ست ولے در نظر ز سرعت سیر

کند چو شعلۂ جوالہ نقطہ پرکاری

(ترجمہ بات ایک ہی ہے لیکن اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے ایک نقطہ جو وجود مطلق ہے ناچتے ہوئے شعلے کی طرح نگاہوں پر ظاہر ہوتا ہے۔) غالب کی تشبیہ ذہنی اور فکری ہے۔ کبیر کی تشبیہ حسی اور زمینی۔

گووند (گووند) کرشن کا نام۔ کرشن وشنو کا اوتار ہیں اس لیے بھگوان یعنی خالق کائنات۔

گیارھویں اور بارھویں مصرعے میں جو تصویر کبیر نے پیش کی ہے وہ بڑی خوبصورت اور عجیب وغریب ہے۔ سانس ہوا کا کھمبا ہے جس کے چاروں طرف جسم مٹی کی ہی ہوئی تصویر ہے۔

پون بات (پون باتی)۔ ہوا کی بتی۔ یہاں سانس چراغ کی لو ہے (شمع عرفان کا اجالا)

(۱۱۴)

من بنیاں بنج نہ چھوڑے
جنم جنم کا مارا بیں اج بھی پورا نہ تولے
پاسنگ کے ادھکاری لے سے، بھولا بھولا ڈولے
گھر میں ڈبدھا گمت بنی ہے،
پل پل میں چت توڑے
کنبہ وا کے سکل حرامی، امرت میں وش گھولے
نم بیں جل میں نم بیں تھل میں،
نم ہی گھٹ گھٹ بولے
کہے کبیر وا سنت کو ذویے، ہردے گانٹھ نہ کھولے

*

ترجمہ:

من کا بنیا اپنا بنیا پن نہیں چھوڑتا۔ یہ جنم جنم کا مارا آج بھی پورا نہیں تولتا۔ کم تولنے کو اس نے اپنا حق سمجھ لیا ہے اور اس کے غرور میں بھولا بھولا رہتا ہے۔ تذبذب نے اس کی عقل خراب کر دی ہے اور وہ ہر لمحہ اپنے ضمیر کو مجروح کرتا ہے۔ اس کا سارا خاندان حرامی ہے کہ وہ امرت میں زہر گھولتا ہے۔ (اوپر سے یہی کہتا رہتا ہے کہ) بحر و بر میں

تم ہی تم ہو، ہر جسم کے اندر تم بول رہے ہو (لیکن دل میں اس کا یقین نہیں ہے)۔ کبیر کہتے ہیں کہ ایسے گیان سے ذریعے جو دل کی گانٹھ نہیں کھولتا (دل کی بات ظاہر نہیں کرتا)۔

(۱۱۵)

میرا تیرا منوا کیسے ایک ہوئی رے
میں کہتا ہوں آنکھن دیکھی،
تو کہتا کاگد کی لیکھی
میں کہتا سلجھاوں ہاری، تو راکھیو اُرجھائی رے
میں کہتا جاگت رہیو، تو رہتا ہے سوئی رے
میں کہتا جاگیو رہیو، تو جاتا ہے موہی رے
نگری نگری پھرا مسافر گھر کا کھوجی نہ ملت کوئی رے
تو تو رنڈی پھرے بسنتی،
سب دھن ڈارے کھوئی رے
سب گرو دھندا جھوٹا ہے، وا میں کچھ نہ دھوئی رے
کہت کبیر سنو بھائی سادھو،
تب ہی ویسا ہوئی رے

*

ترجمہ:

میرا دل اور تیرا دل ایک کیسے ہو سکتا ہے۔ میں آنکھوں دیکھی کہتا ہوں اور تو کتابوں

میں لکھی بات سناتا ہے۔ میں سلجھانے والی بات کہتا ہوں اور تو الجھانے والی۔ میں کہتا ہوں کہ جاگتے رہنا اور تو سوتا رہتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سنسار سے دل نہ لگانا اور تو اس کے موہ میں مبتلا ہے۔ سمجھاتے سمجھاتے جگ بیت گئے لیکن میری کہی ہوئی بات کوئی مانتا نہیں۔ تو تو رنڈی کی طرح آوارہ ہے، اور دھن دولت (ضمیر کی عصمت) کھو بیٹھا۔ کبیر کہتے ہیں کہ ست گرو صاف و پاک پانی کا بہتا ہوا دھارا ہے اور جس نے اپنی کایا اس میں دھوئی وہی ست گرو جیسا ہو سکتا ہے۔

(۱۱۶)

دلہن انگیا کاہے نہ دھووائی

تن اپنے کی میلی انگیا وشیے داگ پر جائی

بن دھوئے پہ ریجھت ناہیں، سیج سیں دست گرائی

سمرن دھان کے صابن کرلے ست نام دریائی

ڈندھا کے بھید کھول نہریا، من کے میل دھووائی

جت کرو سیوں پی بینے، اب تو گون سگجائی

پالنہار دوار ہیں ٹھاڑے، اب کاہے پچھتائی

کہت کبیر سنو ری نہریا، جت اچھن دے آئی

*

ترجمہ:

اے دلہن، تو نے اپنی انگیا کیوں نہیں دھوائی۔ یہ بچپن کی میلی انگیا ہے جس پر نفسانی خواہشات کے داغ پڑے ہوئے ہیں۔ بغیر دھوئے ہوئے پر تم رجھتے نہیں ہیں اور سیج سے گرا دیتے ہیں۔ خدا کی یاد کو اپنا صابن بنالے اور ست نام کو دریا بنالے۔ اے دلہن، تذبذب کی گرہیں کھول دے اور من کا میل دھو ڈال۔ سوچ تو کہ عمر کے تین حصے بیت چکے ہیں اور اب گونے (رخصت) کا وقت قریب آ گیا ہے۔ تیرا پالنے والا

دروازے پر کھڑا ہے، اب کیوں اداس ہے۔ کبیر کہتے ہیں اے دلہن، اپنے دل کی آنکھ میں گیان کا کاجل لگا کر آ جا۔

حاشیہ:

انگیا جسم ہے اور دلہن روح۔

چت انجن. لفظی معنی دل کا کاجل، مراد ہے دل کی آنکھ میں گیان کا کاجل۔

(۱۱۷)

سادھو دیکھو جگ بورانا

سانچی کہو تو مارن دھاوے جھوٹھے جگ پتیانا

بند کہت ہے رام ہمارا مسلمان رحمانا

اپس میں دوؤ لڑے مرت ہیں مرم کوئی نہیں جانا

بہت مے سوسہی بھی دھری پراب کریں اسنانا

اُنہ جھور پنانیں پوجیں، تنک نہوتھا گیانا

اسن مار ڈسنہ دھر سٹھے، من میں بہت گمانا

پیر پاہن ٹوپی پہرے جپ تپ تلک اُنمانا

ساکھی سبدے گاوت بھولے اُنہ کھبر نہ جانا

گھر گھر منتر جو دیں بھرت ہیں ماپ کے اپھمانا

گرووا سہت سشیہ سب بوڑے انت کال پچھتانا

نہتت دیکھے پیر اولیا پڑھیں کتاب کُرانا

کریں مرید کبر بتلاویں انہوں کُھدا نہ جانا

ہندو کی دیا، مہر ترکی کی، دونوں گھر سے بھاگی

وہ کرے جبھہ وار جیتک مارے آگ دوؤ گھر لاگی

نا بدھ بسست چلت ہیں ہم کو آپ کہاویں سیانا
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو، ان میں کون دوانا

*

ترجمہ:

دیکھو سادھو، ساری دنیا پاگل ہو گئی ہے۔ سچی بات کہو تو مارنے کو دوڑتے ہیں لیکن جھوٹ پر ساری دنیا کا ایمان ہے۔ ہندو رام کا نام لیتا ہے اور مسلمان رحمان کا اور دونوں اس بات پر آپس میں لڑے مرتے ہیں لیکن حقیقت سے کوئی واقف نہیں۔ مجھے دھرم اور اس کے قوانین کے ماننے والے بہت ملے جو ہر صبح اشنان کرتے ہیں اور آتما کو چھوڑ کر پتھر کی پوجا کرتے ہیں۔ ان کا علم اور عرفان جھوٹا ہے۔ غرور سے آسن مار کے بیٹھے ہیں اور ان کا من گمان میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ پتھر اور پیپل کو پوجتے ہیں۔ مالا اور ٹوپی پہن کر تلک اور چھاپا لگاتے ہیں۔ نصیحت اور اپدیش (ظاہری علم) کے الفاظ بولتے ہیں۔ وہ آتما سے بے خبر ہو گئے ہیں۔ جو گرو مایا کے غرور میں گھر گھر منتر سناتے پھرتے ہیں وہ گرو اور ان کے چیلے سب ڈوب چکے ہیں اور پچھتاوے کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں نے پیر اور مرید بہت دیکھے ہیں جو کتاب اور قرآن پڑھتے رہتے ہیں، وہ قبر دکھا کر لوگوں کو مرید بناتے ہیں، ظاہر ہے کہ انھوں نے خدا کو نہیں پہچانا۔ ہندو کی دیا اور مسلمانوں کی محبت دونوں ان کے گھروں سے نکل گئی ہیں۔ ایک جانور کو ذبح کرتا ہے اور دوسرا جھٹکا کرتا ہے لیکن آگ دونوں کے گھر میں لگی ہے۔ اس طرح وہ ہم پر تو ہنستے ہیں اور خود سیانے کہلاتے ہیں۔ کبیر کہتے ہیں اے سادھو، تم ہی بتاؤ، ہم دونوں میں کون دیوانہ ہے۔

حاشیہ:

تیرتھ برن بھرلانا۔ اس ٹکڑے کا ترجمہ نہیں کیا ہے کیوں کہ مفہوم صاف نہیں ہے۔

چھاپ چھاپا۔ تلک کی ایک قسم۔ ہندوؤں میں مختلف فرقوں کے تلک الگ الگ ہیں۔

(۱۱۸)

میاں تمھ سو بولناں ہی نہیں آوے
ہم مسکین کہدائی بندے تمھرا جس میں بھاوے
اللہ اول دین کا صاحب جور نہیں پھر ماتا
مُرشد پیر تمھارے ہے کو، کہو کہاں نہیں اتا
روجا کریں نواج گجاریں کلمے پڑھت نہ ہوئی
ستّر کعبے اک دل بھیتر جے کر جانے کوئی
کھسم پچھان برس کر جی میں مال منی کر پھکی
آپا جان سیانی کو جانی، سب ہوئے پڑھت سریکی
ماٹی اٹک، پھینٹی دھر ماناں، سب میں برھم سماناں
کہے کبیر پڑھت چھٹکائی دو جگ ہی میں ماناں

٭

ترجمہ:

میاں، تم سے کہنے کے لیے کوئی بات نہیں بنتی۔ ہم تو مسکین خدائی بندے ہیں، تمھارے جی میں جو آئے وہ سمجھو۔ اللہ دین کا اول اصول ہے اور اس نے زبردستی کی ہدایت نہیں فرمائی ہے۔ تمھارے پیر اور مرشد کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔

روزے رکھنے، نماز گزارنے اور کلمہ پڑھنے سے جنت نہیں ملتی۔ کاش کوئی یہ بات جانے کہ ایک دل میں ستر کعبے موجود ہیں۔ اپنے محبوب کو پہچانو اور دل میں رحم پیدا کرو اور مال و متاع کو حقیر سمجھو۔ بہشت تو تب ملتی ہے جب سائیں (محبوب) کو اپنے پاس محسوس کریں۔ ایک مٹی ہے اور طرح طرح کی شکلیں اور سب میں برہم (ذات مطلق) موجود ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ بہشت اور دوزخ کا تصور من مانا ہے۔

حاشیہ:

روجا روزہ۔

نواج نماز۔

مال متیں: مال متاع۔

دوجگ: دوزخ

ستر کعبے اک دل بھیتر اس تصور سے اردو اور فارسی شاعری بھری پڑی ہے

بت خانہ توڑ ڈالیے مسجد کو ڈھایئے
دل کو نہ توڑیے یہ خدا کا مقام ہے

توڑ کے بت خانے کو مسجد بنا کی تو نے شیخ
برہمن کے دل کی بھی کچھ فکر ہے تعمیر کی

(سودا)

تک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ
جوں شمع حرم رنگ جھمکتا ہے بتاں کا

(سودا)

مے خور و مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن
ساکنِ بت خانہ باش و مردم آزاری مکن

(ترجمہ شراب پیو، مصحف کو جلا دو، کعبے کو آگ لگا دو اور بت خانے میں جا کر بیٹھ جاؤ
لیکن مردم آزاری مت کرو۔ یعنی مردم آزاری سب سے بڑا گناہ ہے۔)

آخری دو مصرعے۔ مائی ایک... سمانا:

حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

(اقبال)

کہیں کبیر... من مانا:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

(غالب)

(۱۱۹)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ترجمہ:

[illegible] پانی میں پیدا ہوئی
اور پانی ہی سے محبت ہے، پھر بھی میں پیاس پیاس چلاتی ہوں۔ میں برہ کی ماری

کھڑی ہوئی تمھاری راہ دیکھ رہی ہوں۔ میرے پیتم، بس تمھاری ہی آس ہے۔ تمھاری محبت میں گھر چھوٹ گیا اور میں تمھارے قدموں میں آ گئی۔ گھر کے اندر میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتی ہوں۔ دن کو بھوک نہیں لگتی، رات کو نیند نہیں آتی اور گھر کا آنگن سہانا نہیں لگتا۔ اب تو میری سیج میری دشمن ہو گئی ہے۔ ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے (جاگ جاگ کر رات کاٹتی ہوں)۔ ساجن، میں تو تمھاری ہی ہوں، تم میرے مالک ہو۔ اے غریب نواز، اب تم رہ رہ کر آ جاؤ۔ تم قادرِ مطلق اور خالق ہو۔ یا تو مجھے اپنا لو، نہیں تو میں جان دے دوں گی۔ دل کے لیے جدائی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اب مجھے اپنا جلوہ دکھا دو۔

(۱۲۰)

تن من دھن بازی لاگی ہو

جوپڑ کھیلوں پیو سے رے میں مو ماھی لگیا

ہاری تو پیا کی ہوئی رے، جیتی تو پیا مورے ہو

جو سرپا کے کھیل میں رے خلک میں کی آس

پرو اکیلی رہ گئی سہیں جیوں کی آسو ہو

چار میں گھر ایک ہے رے، پانچ پانچ کے لوگ

سنتا بات کرتا کوئی، پریت سایو اور ہو

نکو جو راسی پھر مت پھر مت ہو ہے انکی آئے

جواب کے پیا بازی رے، پھر جو راسی جائے ہو

کہیں کبیر دھرم داس سے رے، جیسی ماھی مت ہار

اب کے شرت جڑائے دے رہے، سوئی سپا گی ہار ہو

❀

ترجمہ:

تن من دھن کی بازی لگی ہوئی ہے۔ میں اپنے پریتم کے ساتھ چوپڑ کھیل رہی ہوں اور تن من کی بازی لگا دی ہے۔ اگر بازی تو پریتم کی ہو جائے گی اور جیتی تو پریتم میرے

ہو جائیں گے۔ چوسر کے اس کھیل میں جنگ طن کی آس ہے۔ گوٹ اکیلی رہ جائے تو اس کے بچنے کی امید نہیں رہتی ہے۔ رنگ چار ہیں لیکن آخری گھر ایک ہے۔ بھانت بھانت کے لوگ ہیں تو کیا۔ خیال، بات اور عمل تینوں سے اپنی محبت نبھاؤ۔ سب چوراسی لاکھ جنم کے چکر میں بھٹک رہے ہیں اور بات پو پر اٹکی ہوئی ہے۔ اگر اب کے پو نہ پڑی تو پھر چوراسی لاکھ جنم لینے پڑیں گے۔ کبیر دھرم داس سے کہتے ہیں کہ جیتی بازی مت ہارنا۔ جو اب کے محبت کو داؤں پر لگا دے وہی عورت سہاگن ہے۔

حاشیہ

جنگ طن چوسر کے کھیل میں جب ایک خانے میں دو گوٹیں جمع ہو جاتی ہیں تو وہ پٹ نہیں سکتیں۔ اس کو جنگ طن کہتے ہیں۔ سودا کا شعر ہے

امن دو دل کو ہو یکساں بہ بساط دوراں
چوٹ کھاتی نہیں وہ نرد جو ہو نرد کے ساتھ

بساط دوراں: زمانے کی بساط۔ نرد: گوٹ۔

چار رنگ چار رنگ، چوسر کے کھیل میں گوٹوں کے چار رنگ اور ہندو دھرم میں ذاتوں کے چار رنگ، یہاں دونوں مفہوم ہیں۔

چوراسی چوسر کے کھیل میں گوٹ کو چوراسی گھر چلنے پڑتے ہیں تب کہیں جا کر اس کی گردش ختم ہوتی ہے۔ ہندو عقیدہ ہے کہ نروان سے پہلے انسان کو چوراسی لاکھ جنم لینے پڑتے ہیں۔

پو جب گوٹ آخری گھر میں پہنچ جاتی ہے تو جیتنے کے لیے پو ضروری ہے۔ یہاں پو سے مراد موت اور نروان ہے۔ جو گوٹ چوراسی گھر چلنے اور پو پڑنے کے بعد اندر پہنچ گئی وہ پھر باہر نہیں نکلتی، گویا اس کا نروان ہو گیا۔

(۱۲۱)

کیسے دن کٹھیں جتن بتائے جنیو
ابھہ پار گنگا اوہ پار جمنا
بچواں سُرتیا ہم کاں چھوائے جنیو
انجرا پنجر کیے کا گج بنائیں
اپنی سُرتیا پیرے لکھائے جنیو
کہت کبیر سنو بھائی سادھو
سپیاں بکرِ کیں دیا بتائے جنیو

ترجمہ:

[illegible]

حاشیہ:

[illegible]

(۱۲۲)

گگن کی اوٹ نسانا ہے

دہنے سور چندرما بائیں، تنکے بیچ چھپانا ہے

تن کی کماں سُرت کی ووداء، سبد بان لے تانا ہے

مارت بان بدھا ہی ہی تن، ستت گرو کی پروانا ہے

ماریو بان گھاؤ نہیں تن میں، جن لاگی ہی جانا ہے

کہیں کبیر سنو بھائی سادھو، جن جانا تن مانا ہے

ترجمہ:

نشان آسمان کی اوٹ ہے۔ داہنی طرف سورج ہے بائیں طرف چاند اور نشان بیچ میں چھپا ہوا ہے۔ تن کی کماں اور عشق کی کمان اور عشق کی ڈوری اور شبد (لفظ = نام - صوت سرمدی) کا تیر تان لیا ہے اور اس تیر نے تن کو چھید ڈالا ہے لیکن زخم دکھائی نہیں دیتا۔ جنھوں نے زخم کھایا ہے وہی جانتے ہیں۔ بھائی سادھو سنو، کبیر کہتے ہیں جو جان گئے ہیں وہ اس بات کو مانتے ہیں۔

(۱۲۳)

سوچ سمجھ اپھمانی، چادر بھیگی ہے ترائی
مکرے ٹکڑے جور غلیظ سوں، سی کے ایک لپٹائی
ترڈاری سمی ہاتھ سوں جوجھ موں سی سمائی
سمجھ نکسو تس کے جتن، نہ دھوئی بھل پائی
ساری عمری اوڑھے سی، بھی نری نہیں جائی
سمکھ مان حال جیسا ایسے، سمجھ ہے جیسے ترائی
کہے کبیر دھر اکھ جس سے پھیر ہاتھ نہیں آئی

❋

ترجمہ:

اے مغرور انسان! یہ سوچ کہ تیری چادر پرانی ہو چکی ہے۔ بڑے جتن سے ٹکڑے جمع کر کے سی لیے ہیں اور پھر انہیں جسم سے لپیٹ لیا ہے۔ تو نے گناہوں سے یہ چادر میلی کر دی ہے اور اپنی سانس سے اسے گندا کر دیا ہے۔ نہ اس میں تو نے گیان کا صابن لگایا نہ اسے اچھی طرح پانی سے دھویا۔ ساری عمر اوڑھتے بیت گئی اور تو نے بھلے برے کی تمیز نہیں کی۔ شک اور شبے میں مبتلا رہا یہ سمجھ لے کہ یہ دوسرے کی چیز ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ اسے جتن سے رکھ، یہ پھر ہاتھ نہیں آئے گی۔ (چادر سے مراد زندگی ہے۔)

(۱۲۴)

اَن پراپت وستُ کو کہا تجے،
پراپت کو تجے سو تیاگی ہے
سُن اصیل تُرنگ کہا پھیرے،
ابھتر پھیرے سو باگی ہے
جگ نِھو کا گاونا کیا گاوے،
اَنبھَو گاوے سو راگی ہے
بن گیہہ کی باسنا ناس کرے،
کبیر سوئی بیراگی ہے

ترجمہ:

جو چیز حاصل نہیں ہوئی اسے کیا ترک کرتا ہے، جو حاصل ہو چکا ہے اسے ترک کرنے والا تیاگی ہے۔ اصیل گھوڑے کو کیا پھیرنا، جو اڑیل گھوڑے کو پھیرے وہ بگدھری جانتا ہے۔ دنیا کے تجربے کا گانا کیا گاتا ہے، اصلی راگ جاننے والا وہ ہے جو اپنے تجربے کا گیت گاتا ہے۔ کبیر کہتے ہیں کہ بیراگی وہ ہے جو گھر اور جنگل دونوں کی خواہش کو ترک کر دے۔

(۱۲۵)

تو لو پیو میں گیے، گھونگھٹ کے پٹ کھول رے
گھٹ گھٹ میں وہی سائیں رمتا،
کٹک بجن مت بول رے
دھن جوبن کو گرب نہ کیجے،
جھوٹا پنچ رنگ جول رے
سر مجھل میں دیا بارے، آسا سیوں مت دول رے
جوگ بھگت کا رنگ مجھل میں، ایسا ہی انمول رے
کہے کبیر سنو بھئی سادھو، ساہب ملسی ڈھول رے

ترجمہ:

تو تو پریتم میں کے، اپنے گھونگھٹ کے پٹ کھول دے۔ ہر جسم میں وہی ایک مالک آباد ہے۔ کنگن سے زیادہ بول کیوں بولتا ہے۔ دولت اور جوانی کا غرور مت کر کیوں کہ یہ پانچ رنگ کا جھوٹا ہے۔ شوق کے محل میں چراغ جلائے اور امید کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑ۔ سچے یوگ کے تجربے سے رنگ محل میں تجھے انمول پریتم ملے گا۔ کبیر کہتے ہیں کہ صوفیو سرمدی کا سورج رہا ہے اور مسرت ہی مسرت ہے۔

(۱۲۶)

ڈٹی جگدیس کہاں تے آیا، کہنہ کوئے بھرمایا
اللہ، رام، کریما، کیسو، ہجرت نام دھرایا
گھڑا ایک کتک نی گڑھیا، اِک مٹی بھاؤ نہ دوجا
کہن شش کو ذر کرپاہیں، اک سماج اک پوجا
وہی مہادیو وہی محمد، برہما، آدم کہیے
کوہ بدو کوتُرک کہاوے، ایک حسن پر رہیے
وید کتیب پڑھے وے کتا، وے مولانا وے پانڈے
سکر سگر ناہ دھرائے، اک منہ کے پاکھنڈے
کہیں کبیر وے دوجوں بھولے، رام نہ کہیوں نہ پاوے
وے کیسنی وے گائے کساویں، ناد نہ جسم کساوے

ترجمہ:

دو جگدیش (دنیا کے مالک) کہاں سے آئے۔ تجھے اس بھرم میں کس نے مبتلا کر دیا ہے۔ اللہ رام، رحیم الگ الگ کیسے ہو سکتے ہیں۔ ایک سونے سے سب زیور بنائے گئے ہیں۔ ان میں دوسری قدر و قیمت نہیں ہے۔ یہ سب، ایک مٹی، ایک پوجا، کہنے

سننے کی باتیں ہیں، ان کو اپنے وجود سے دور کر دے۔ وہی مہادیو ہے وہی محمد، جو برہما ہے اس کو آدم کہنا چاہیے۔ کوئی ہندو کہتا ہے اور کوئی مسلمان، لیکن رہتے ایک زمین پر ہیں۔ ایک وید کی کتابیں پڑھتا ہے اور ایک خطبہ، ایک مورتی کہلاتا ہے اور ایک پنڈت۔ الگ الگ نام رکھ لیے ہیں، ورنہ برتن سب ایک ہی مٹی کے ہیں۔ کبیر کہتے ہیں کہ وہ دونوں گمراہ ہیں، رام (خدا) کو کسی نے نہیں پایا۔ ایک بکرا کاٹتا ہے دوسرا گائے ذبح کرتا ہے اور دونوں اسی جھگڑے میں اپنی زندگی گنواتے ہیں۔

(۱۲۷)

من تم ناہک ڈند مچائے
کر اسمان چھوو تنہہ کاہو، پانی پھول چڑھائے
مُورت سے دنیا پھل مانگے، اپنے ہاتھ بنائے
یہ جگ پوجے دیو دیہرا، تیرتھ ورت انہائے
چلت پھرت میں پاؤں تھکت بھے، یہ دُکھ کہاں سمائے
جھوٹھی کایا جھوٹھی مایا، جھوٹھے جھوٹھل کھائے
بانجھن گائے دودھ تنہہ دیہے، ماکھن کہاں سے پائے
سانچے کی سنگ سانچ بسٹ ہے، جھوٹھے مارِ بنائے
کہے کبیر جنہیں سانچ وسٹ ہے سہجے درسن پائے

❁

ترجمہ:

اے من، تو ناحق ڈند مچا رہا ہے۔ پھول پتی چڑھا کے بھی کوئی آسمان کو ہاتھوں سے نہیں چھو سکتا۔ دنیا اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی مورتی سے پھل مانگتی ہے اور دیوتاؤں کی چوکھٹ پوجتی ہے اور تیرتھ پر جاتی ہے، برت رکھتی ہے اور اشنان کرتی ہے۔ اس چکر میں چلتے چلتے پاؤں تھک جاتے ہیں۔ آخر یہ دکھ کہاں سمائے گا۔ کایا بھی جھوٹی ہے، مایا

بھی جھوٹی ہے، ناحق تو جھوٹھن کھاتا پھرتا ہے۔ بانجھ گائے جب دودھ ہی نہیں دے گی تو تجھے مکھن کہاں سے ملے گا۔ سچے کے ساتھ سچا ہی بستا ہے۔ جھوٹے کو مار کے بھگا دو۔ کبیر کہتے ہیں کہ جہاں صداقت بستی ہے وہاں دیدار اور جلوہ بڑا بے تکلف ہوتا ہے۔

(۱۲۸)

یہ جگ اندھا میں کیہہ سمجھاوں
اک ڈنی ہوں انہیں سمجھاوں
سب ہی بھلانا پیٹ کے دھندا
پانی کے گھوڑا ہوں اسوروا ڈھرک پرے
جس اوس کے بُندا
گہری ندیا اگم بہے دھروا کھیون ہارا پڑ گا پھندا
گھر کی وستُ تکٹ ننہہ آوت دینا بار کے
ڈھونڈھت اندھا
لاگی آگ سکل بن جرگا بن گر گیان بھٹکیا بندا
کہے کبیر سنو بھائی سادھو اک دن جاوے
لنگوٹی جھار بندا

❁

ترجمہ:

یہ ساری دنیا اندھی ہے، میں کس کو سمجھاؤں۔ ایک دو ہوں تو میں انھیں سمجھانے کی کوشش بھی کروں۔ یہاں تو سب ہی پیٹ کے دھندے میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ پانی

کے گھوڑے پر ہوا کا سوار ایسے لپک جاتا ہے جیسے اوس کی بوند۔ (حقیقت کی) اتھاہ ندی بہہ رہی ہے اور اس کی دھار کے بیچ میں کھیون ہار پھنس گیا ہے۔ گھر کی چیز کے قریب نہیں جاتا لیکن اندھا چراغ جلا کر اِدھر اُدھر ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ آگ لگی اور سب کچھ جل گیا۔ گرو کے گیان (عرفانِ حق) کے بغیر بندہ بھٹک رہا ہے۔ سنو بھائی سادھو، کبیر کہتے ہیں کہ یہ بندہ ایک دن لنگوٹی جھاڑ کے رخصت ہو جائے گا۔